# اکائی:1۔ مکتوب نگاری کا فن

ساخت:


1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 مکتوب نگاری کا فن

1.4 مکتوب نگاری کے اقسام

1.5 اُردو میں مکتوب نگاری کی اہمیت

1.6 اُردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقاء

1.7 اُردو کے چند اہم مکتوب نگار

1.8 خلاصہ

1.9 اپنی معلومات کی جانچ۔جوابات

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.11 فرہنگ

1.12 سفارش کردہ کتابیں


munotes.in

## 1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو خط کی تعریف ومفہوم،خصوصیات،اجزائے ترکیبی اور اقسام کو سمجھنے میں مدد کرنا ہے۔اس کے علاوہ اردو کے چند اہم مکتوب نگاروں سے واقف کرانا ہے۔اس اکائی کا مقصد طلبا کو مکتوب نگاری کی اہمیت اور آغاز و ارتقا سے واقف کرانا بھی ہے۔

## 1.2 تمہید

مکتوب نگاری غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔اس اکائی میں مکتوب نگاری کی تعریف کی گئی ہے اور مکتوب نگاری کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ خطوط نگاری کے اقسام کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ادب میں مکتوبات کی

اہمیت وافادیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔مکتوبات نگاری کے آغاز وارتقاء کو بیان کرتے ہوئے چند اہم مکتوب نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس باب کے مطالعے سے مکتوب نگاری کی تعریف وخصوصیات واہمیت کے علاوہ اہم مکتوب نگاروں کو جاننے کے قابل ہوسکیں گے۔

## 1.3 مکتوب نگاری کا فن

اُردو کی ادبی نثر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر۔اول الذکر میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں جب کہ موخر الذکر اصناف میں مضمون، انشائیہ، سوانح نگاری، خودنوشت، سفرنامہ اور مکتوب نگاری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ جہاں تک مکتوب نگاری یا خطوط نویسی کا تعلق ہے، یہ ایک غیر افسانوی صنفِ ادب ہے۔خط یا مکتوب دو آدمیوں کے درمیان فاصلے کی وجہ سے کی گئی تحریری گفتگو کا نام ہے۔خط عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''لکیر'' یا ''تحریر'' کے ہیں۔زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ لفظ خط کے معنی ومفہوم میں بھی تبدیلی آئی اور یہ لفظ مکتوب یا نامہ کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔خط دراصل دو افراد کے مابین ترسیل خیال کا ایک وسیلہ ہے جس میں ایک شخص دور رہنے والے شخص تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔

Directory of World Literature میں خط کی تعریف کرتے ہوئے شپلے (Shipley) لکھتا ہے:

> ''خط عام طور سے مکتوب نگار (پہلا آدمی) اور مکتوب الیہ (دوسرا آدمی) کے بیچ تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے''

مولوی عبدالحق کے مطابق:

> ''مکتوب انسان کے دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔اس میں صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا''

اس طرح اصطلاحی معنوں میں وہ بات جو ایک شخص کسی دوسرے شخص تک پہنچانا چاہتا ہے مگر اسے مکانی قربت حاصل نہیں ہے یعنی فاصلے کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرسکتا اور اپنی بات کاغذ پر تحریر کرکے بھیجتا ہے تو وہ خط کہلاتا ہے۔کاتب یعنی خط لکھنے والے اور مکتوب الیہ یعنی جس کو خط لکھا جائے، ان دونوں کے آپسی تعلقات اور راز ونیاز جس تحریر میں نمایاں ہو اسے خط کہتے ہیں۔خطوط کے ذریعے دو اشخاص کے درمیان موجودہ تعلقات وحالات کی معلومات حاصل ہوتی ہے۔اس طرح خط یا مکتوب کے ذریعے دو لوگ آپس میں ربط قائم کرسکتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے خط کو آدھی ملاقات بھی کہا جاتا ہے۔خط لکھنے والے کو خطوط نویس، کاتب یا مکتوب نگار کہتے ہیں اور جس کو خط لکھا جارہا ہے اسے مکتوب الیہ کہتے ہیں۔

کاتب اور مکتوب الیہ کے تعلقات کا اظہار جس تحریر میں ہوگا اسے مکتوب نگاری کہتے ہیں۔خطوط وہ تحریریں ہیں جن میں مکتوب نگار اپنے خیالات وجذبات کو قلمبند کر کے مکتوب الیہ کو بھیجتا ہے۔ایک خط میں حسبِ ذیل اجزاء ہوتے ہیں:

## 1۔سرنامہ:

خط شروع کرنے سے پہلے دائیں جانب کاتب کا نام، پتہ اور تاریخ تحریر کرنا 'سرنامہ' کہلاتا ہے۔

## 2۔القاب وآداب:

مکتوب الیہ کی عمر، شخصیت، عہدہ اور رشتہ کی مناسبت سے مخاطب کرنے کو 'القاب' کہتے ہیں۔جیسے محترم، عزیزی ،ڈیر وغیرہ۔اس کے بعد آداب لکھے جاتے ہیں۔جیسے السلام وعلیکم، آداب وغیرہ۔

## 3۔نفسِ مضمون:

القاب وآداب کے بعد نفسِ مضمون تحریر کیا جاتا ہے۔اس میں مکتوب نگار اپنے حالات، جذبات، دلی کیفیات اور واقعات کا ذکر کرتا ہے۔

## 4۔اختتامی کلمات:

خط کو اختتامی مرحلہ پر لانے کو 'اختتامی کلمات' کہتے ہیں، جس اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار اپنی بات مکمل کر چکا۔ جیسے خدا حافظ، اب اجازت۔۔۔وغیرہ۔

## 5۔معجز بیانی:

آخر میں عجز وانکساری کا اظہار کرتے ہوئے اپنا نام لکھنا یا دستخط کرنا 'معجز بیانی' کہلاتا ہے۔جیسے مخلص، خیر خواہ وغیرہ۔

## 6۔مکتوب الیہ کا پتہ:

سب سے آخر میں مکتوب الیہ کا نام اور پتہ خط پر لکھا جاتا ہے۔یہی نام اور پتہ لفافے پر بھی لکھا جاتا ہے۔ اس طرح ایک خط لکھنے کے لیے ان تمام خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

۱۔ خط کے کتنے اجزاء ہیں؟

۲۔ خط کو اختتامی مرحلہ پر لانے کو کیا کہتے ہیں؟

۳۔ خط کے آخر میں اپنا نام لکھنا یا دستخط کرنا کیا کہلاتا ہے؟

munotes.in

۴۔ خط لکھنے والے کو کیا کہتے ہیں؟

۵۔ جس کو خط لکھا جا رہا ہے اسے کیا کہتے ہیں؟

## 1.4 خطوط کی اقسام

اُردو میں خطوط نگاری کے مختلف طریقہ رائج ہیں۔ موضوع اور مخاطب کے اعتبار سے خطوط کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ خطوط کو حسبِ ذیل اقسام میں پیش کیا جاسکتا ہے:

### 1۔ نجی / خانگی خطوط :

عزیزوں اور رشتہ داروں وغیرہ کو لکھے جانے والے خطوط نجی یا خانگی خطوط کے دائرے میں آتے ہیں جس میں رشتہ داری اور خاندان کے تعلقات کو بنیاد بنا کر لکھی جانے والی تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ دوست احباب اور ہم عمر لوگ ایک دوسرے سے رابطہ میں رہنے کے لیے جو خطوط لکھتے ہیں وہ بھی نجی یا ذاتی خطوط کے زمرے میں آتے ہیں۔

### 2۔ سرکاری خطوط:

سرکاری خطوط میں افسروں کے نام درخواستیں، افسروں کے باہم دفتری اُمور سے متعلق خط و کتابت، رپورٹ، حکم نامے وغیرہ شامل ہیں۔

### 3۔ کاروباری خطوط:

کاروبار یا تجارت کے سلسلے میں لکھے جانے والے خطوط کاروباری خطوط کہلاتے ہیں۔

### 4۔ اخباری خطوط:

یہ خطوط اخبار کے مدیر (ایڈیٹر) کے نام لکھے جاتے ہیں جس میں ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں تعریف یا تنقید لکھی جاتی ہے۔ ان خطوط کا مقصد ارباب مجاز کی توجہ مبذول کرانا ہوتا ہے۔

### 5۔ درخواست:

رخصت، ملازمت، بیماری، داخلہ یا علاحدگی کے موقع پر لکھے جانے والے خط کو درخواست کہا جاتا ہے۔

### 6۔ رقعہ جات:

عام طور پر کسی فوری ضرورت کے لیے لکھی جانے والی تحریر رقعہ جات کہلاتی ہے۔ یہ رقعہ القاب و آداب اور رسمی اجزاء سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

اس طرح مکتوب نگاری کے مختلف طریقے و انداز اُردو میں مروج ہیں۔

munotes.in

## اپنی معلومات کی جانچ

۱۔ خط کا تعلق کس صنفِ ادب سے ہے؟

۲۔ خط کونسی زبان کا لفظ ہے؟

۳۔ خط کے کیا معنی ہیں؟

۴۔ خط کی کتنی اقسام ہیں؟

۵۔ فوری ضرورت کے تحت لکھی جانے والی تحریر کیا کہلاتی ہے؟

## 1.5 اُردو میں مکتوبات کی اہمیت

مکتوب یا خط صرف ایک تحریر کی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسے صاف اور شفاف آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں صاحبِ تحریر کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نمایاں ہوجاتی ہے۔ کسی بھی شخصیت اور اس کے مزاج و کردار کے نفسیاتی اور تجزیاتی مطالعے کے لیے اس کی تخلیقات سے کہیں زیادہ مکاتب معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ادب میں خطوط کئی حیثیتوں سے اہمیت کے حامل ہیں۔ خطوط کی لسانی، تاریخی، سوانحی، علمی و ادبی اہمیت مسلم ہے۔ اس کے علاوہ خطوط مکتوب نگار کے احساسات و جذبات و افکار و خیالات، شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کو سمجھنے میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔

اُردو زبان و ادب میں خطوط کا سرمایہ بڑا قیمتی اور قابلِ فخر ہے۔ خطوط زبان و ادب اور تاریخ و تہذیب کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جذبات و احساسات کا اظہار بھی موزوں و مناسب الفاظ میں ہو جو فن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں۔ قاری محظوظ بھی ہو اور ان تجربات میں اپنے آپ کو بھی شامل محسوس کرے اور یہی اعلیٰ ادب کی سب سے اہم خوبی ہوتی ہے جو اسے زماں و مکاں کی بندشوں سے آزاد کرتی ہے۔ یہی خصوصیات ہمیں مکتوب نگاری میں ملتی ہیں۔

یوں تو مکتوب نگاری کو انسانی ضرورتوں نے جنم دیا لیکن اس ضرورت نے آہستہ آہستہ ایک فن کی شکل اختیار کر لی اور اچھے خطوط کو فن کا نمونہ جان کر محفوظ کیا جانے لگا جس کے نتیجے میں ادبی سرمایہ کا ایک بڑا حصہ خطوط پر مشتمل ہے جن کے مطالعے سے قارئین نہ صرف محظوظ و مسرور ہوتے ہیں بلکہ بہت ساری علمی و معلوماتی فائدے بھی حاصل کرتے ہیں۔

خطوطِ غالب میں ہم اس عہد کی پوری تاریخ دیکھ سکتے ہیں۔ غدر کے حالات اور واقعات کے ذیل میں تو یہ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ اس میں صرف ان کے مشاہدات ہی نہیں بلکہ تجربات بھی شامل ہیں۔ خطوطِ غالب سے دہلی کے اس وقت کے حالات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دہلی کو اور وہاں پیش آنے والے واقعات کو ہندوستان کی تاریخ میں

بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سرسید جیسے مصلح قوم کے خطوط ان کی با مقصد زندگی کے آئینہ دار ہیں۔سرسید مقصدیت پر بہت زور دیتے تھے ان خطوط میں ادبیت کم ہے لیکن ان کے خطوط اپنے عہد کی سماجی زندگی کے نقیب ہیں۔ان خطوط میں فکری بصیرت اور اصلاحی نقطۂ نظر کے علاوہ تاریخ وتہذیب کو بڑا دخل ہے۔حالی کے خطوط سے قوم کے لیے ان کی ہمدردی اور دردمندی کا احساس ہوتا ہے۔قوم کی زبوں حالی اور ابتری کا منظر نامہ ہیں۔شبلی کے خطوط اپنی علمی ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ قومی شعور کے نقوش بھی رکھتے ہیں۔ان کے علاوہ دیگر معاصرین کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔خطوط کے ذریعے مکتوب نگار کی شخصیت کا صحیح اور قطعی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کسی بھی فنکار کی سوانح مرتب کرنے میں خطوط بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان سے بہت سا سوانحی مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔خطوط میں انسان اپنے دوستوں کو اپنی دلچسپیوں،خوشیوں،مصیبتوں کے علاوہ اپنے دل کے راز، ہر قسم کی تمنائیں اور آرزوئیں لکھ دیتا ہے۔اور چوں کہ لکھتے وقت خطوط کے شائع ہونے یا کسی غیر متعلق شخص کے دیکھنے کا دور تک گُمان نہیں ہوتا اس لیے لکھنے والا ان کے بیان میں پوری آزادی اور بے تکلفی سے کام لیتا ہے۔

ادیبوں،شاعروں اور دانشوروں کے خطوط کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ان کی مدد سے ہم ان کی شعری وادبی تخلیقات کی داد وتحسین دے سکتے ہیں اور عالموں اور دانشوروں کے خطوط کے ذریعے جہاں مختلف علمی مسائل پر ان کے خیالات اور تبصروں سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔وہیں ان سے اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی اصلاح اور ترقی میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔مکتوبات سے صرف مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے ذاتی تعلقات ہی معلوم نہیں ہوتے بلکہ ان کے افکار وجذبات، خیالات ونظریات،سیرت وکردار اور ان کے زمانے کے سیاسی ومعاشرتی حالات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور ان کے سوانح حیات اور ان کے عہد کے تاریخی واقعات وحادثات کو مرتب کرنے میں بھی یہ خطوط کارآمد ہوتے ہیں۔

## 1.6 اُردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا

اُردو میں نثری صنف کی حیثیت سے خطوط نگاری کا آغاز مرزا غالب کی تحریروں سے ہوا۔مولانا حالیؔ نے اپنے استاد مرزا غالبؔ کی سوانح لکھنے کے دوران لکھا ہے کہ غالبؔ نے 1850ء کے دوران اُردو میں خطوط لکھنے کی بنیاد رکھی جب کہ خطوطِ غالب میں 1846ء کے تحریر کردہ چار خطوط موجود ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو میں خطوط نگاری کا آغاز غالب کے خطوط کی وجہ سے 1846ء میں ہوا۔غالب سے پہلے اردو مکتوب نگاری کے سلسلے میں دو اور نام غلام غوث بے خبر اور رجب علی بیگ سرور کے ملتے ہیں۔مرزا غالب کے خطوط کے دو مجموعے ''اُردوئے معلیٰ'' اور ''عود ہندی'' کے نام

سے شائع ہو چکے ہیں۔ مختصر القاب کے ساتھ غالب نے بے ساختہ خطوط لکھے جنھیں اُردو کے مایہ ناز خطوط میں شمار کیا جاتا ہے۔ غالب نے خود اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ:

''میں نے وہ طرزِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزاروں میل دور رہا کرو اور وصل کے مزے لیا کرو''

غالب کے خطوط میں سادگی اور بے ساختہ پن کی وجہ سے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری میں غالب جس قدر مشکل پسند ہیں وہ اپنے خطوط میں اسی قدر آسان پسند نظر آتے ہیں۔ غالب کے بعد اردو کے بیشتر شاعر اور ادیب کے خطوط اشاعت پذیر ہونے لگے۔ سرسید اور ان کے نامور رُفقاء کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ چوں کہ خطوط آپسی تعلقات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اس لیے خطوط کے مواد سے زیادہ اسلوب کی اہمیت ہوتی ہے۔ خیالات کی پیشکشی میں روانی اور تسلسل کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی چاشنی برقرار رہے تو ایسے خطوط اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو میں ادبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیتوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ سرسید احمد خان کے خطوط اردو نثر میں اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ ایک مصلح کی حیثیت سے انھوں نے احباب کو خطوط لکھے۔ ان کی شخصیت کا پَرتو ان کے خطوط میں ان کے تاریخی شعور کا وجدان محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مولانا حالی کے خطوط میں اصلاحی رجحان کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط ''غبارِ خاطر'' میں انشا پردازانہ اسلوب جھلکتا ہے۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور علامہ اقبال کے خطوط میں قومیت اور حریت کے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ اردو میں منظوم خطوط کے علاوہ خواتین کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواتین کے خطوط میں نسائی حسیت کا پَرتو دکھائی دیتا ہے۔ ''غبارِ خاطر'' کی انشا پردازی کے مقابل صفیہ اختر کے ''زیرِ لب'' کے خطوط ایک فراق زدہ شوہر پرست خاتون کے جذبات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

## 1.7 اُردو کے چند اہم مکتوب نگار

عام طور پر مرزا غالب کو اردو میں مکتوب نگاری کا موجد سمجھا جاتا ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ غالب سے پہلے بھی اردو میں مکتوب نگاری کی روایت موجود تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان مکاتیب میں خطوطِ غالب کی سی سادگی اور بے تکلفی شاذ و ناز ہی ملتی ہے۔ غالب سے پہلے اردو میں مکتوب نگاری کے سلسلے میں دو نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک رجب علی بیگ سرور اور دوسرا غلام غوث بے خبر۔ رجب علی بیگ سرور کے مجموعہ مکاتیب ''انشائے سرور'' کو مرزا احمد علی نے مرتب کر کے 1886ء میں نول کشور پریس لکھنو سے شائع کیا تھا۔ غلام غوث بے خبر کے دو مجموعے ہائے مکاتیب کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ''فغان بے خبر'' اور دوسرا ''انشائے بے خبراں''۔ اول الذکر نا پید ہے اور آخر الذکر کو مرتضیٰ حسین بلگرامی نے 1960ء میں علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔

## مرزا غالب

مرزا غالب اردو کے جتنے اہم شاعر تھے اتنے ہی اہم نثر نگار بھی تھے۔ اگر انھوں نے شاعری نہ کی ہوتی اور صرف خطوط ہی لکھے ہوتے، تب بھی تاریخ ادب اردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔ غالب کے خطوط کے متعدد مجموعے ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت ''عودِ ہندی'' اور ''اُردوئے معلیٰ'' کو حاصل ہوئی اور ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس دور کی مکتوب نگاری پر فارسیت کی گہری چھاپ تھی۔ اردو خطوط میں عربی و فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ و تراکیب، مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی، پر پیچ اسلوب بیان اور مخاطبت کے لیے طویل فقرے یا القاب کا استعمال عام تھا۔ غالب کی جدت پسندی نے اس رجحان کے برعکس نہ صرف بول چال کے انداز مین سیدھی سادی اور عام فہم زبان استعمال کی بلکہ القاب و آداب بھی نہایت مختصر کر دیئے جیسے مرزا۔ میاں، مہاراج، اجی۔ مولانا علائی، میری جان وغیرہ۔ ان کے خطوط کا مطالعہ کریں تو وہ ایک ایسے سادگی پسند نثر نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جسے پر تصنع اور پُر تکلف عبارت پسند نہیں۔ خطوط میں غالب اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ بات چیت کے انداز میں سیدھی سادی اور مختصر عبارت میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیں۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنی تحریر کو تقریر اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔

## شبلی نعمانی

شبلی کے خطوط کے دو مجموعے ''مکاتیبِ شبلی'' اور ''خطوطِ شبلی'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں سر سید، حبیب الرّحمن خاں، پروفیسر عبدالقادر، عبدالماجد دریابادی، ابوالکلام آزاد اور امہدی افادی کے نام خطوط میں شامل ہیں اور آخر الذکر مجموعے میں ممبئ کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم کے نام مکاتیب ہیں۔ پہلا مجموعہ شبلی کی ادیبانہ اور عالمانہ شخصیت کی عکاسی کرتا ہے اور دوسرا اردو میں رومانی نثر کے اولین نمونوں میں شمار ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی ایک کثیر الجہات ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک زبردست عالم دین، نقاد اور مورّخ تھے اور اس کے پہلو بہ پہلو ایک باکمال شاعر بھی تھے۔ اسی لیے ان کے مکاتیب میں بھی ان کی شخصیت کے مختلف رنگوں کا پَرتو دکھائی دیتا ہے۔

## مہدی افادی

مہدی افادی کی دو تصانیف ''افاداتِ مہدی'' اور ''مکاتیبِ مہدی'' ہے۔ یہ دونوں کتابیں ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ مکتوب نگاری میں مہدی افادی شبلی کے رنگ کے مداح اور اُنہی کے پیرو تھے۔ وہ اپنے خطوط میں مکتوب الیہ کی ذات کو زیادہ مرکوز توجہ بناتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ توجہ حسنِ بیان اور ادیبانہ شان پر دیتے ہیں۔ مکاتیبِ

مہدی ان کی رنگین اور جمالیاتی شخصیت اور مذاقِ خاص کی ترجمانی کرتے ہیں۔مہدی افادی، سعی وکاوش سے خطوط لکھتے ہیں اوران کی آرائش وزیبائش میں حددرجہ حسن کاری اورنفاست پسندی سے کام لیتے ہیں۔

## علامہ اقبال

علامہ اقبال نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعراورفلسفی تھے بلکہ ایک بلند قامت نثر نگار بھی تھے۔ان کے دوسرے نثری سرمایے سے قطع نظر جس میں خطابات، مقالات ومضامین اور تقاریر و بیانات شامل ہیں۔ان کے مجموعے ہائے مکاتیب کی تعداد ایک درجن سے زیادہ اور مکاتیب کی تعداد ایک ہزار تین سو(1300) سے متجاوز ہے۔مکاتیبِ اقبال سے متعلق اب تک متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں اور آئندہ بھی شائع ہوتے رہیں گے۔

اقبال ایک بسیارنویس مکتوب نگار تھے۔ان سے استفادہ کرنے والوں، مداحوں اوردوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بلاشبہ ہزاروں خط لکھے ہوں گے۔اقبالؔ نے اردواورانگریزی اور جرمنی تینوں زبانوں میں خط لکھے۔معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ انھیں خط لکھا کرتے تھےاور اقبال خط کا جواب دینے میں نہ صرف بڑی باقاعدگی سے کام لیتے تھے بلکہ تعجیل کوبھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔اقبال خط کا جواب کم سے کم لفظوں میں نہایت مختصر لکھتے تھے۔خطوط میں انھوں نے ہمیشہ بے جا تکلف اورحشو وزوائد سے اجتناب برتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ذخیرۂ مکاتیب میں زیادہ تر مکاتیب نہایت مختصر ہیں۔

## مولانا آزاد

مولانا آزاد کے مکاتیب کے کئی مجموعے منظرعام پرآئے لیکن اپنی خصوصیات کی بناء پر جوشہرت اورمقبولیت ''غبارِ خاطر'' کے حصے میں آئی وہ کسی اور مجموعے کو نہ مل سکی۔غبارِخاطر کے علاوہ مولانا کے خطوط کے اوربھی کئی مجموعے'' کاروانِ خیال، مکاتیبِ ابوالکلام، نقشِ آزاد، تبرکات آزاداور میراعقیدہ کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔

غبارِخاطر مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جوانھوں نے قلعہ احمدنگر کے زمانہ اسیری میں 3اگست 1945ء کے درمیانی عرصے میں اپنے دوست مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نام تحریر کیے تھے۔

## مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق ایک زودنویس مکتوب نگار ہیں۔وہ اپنے خطوط میں مطلب کی بات پر اکتفا کرتے ہوئے غیر ضروری اُمور سے اجتناب کرتے ہیں۔ان کی خطوط نویسی مدعا نگاری کی بہترین ہے۔انھوں نے حسبِ ضرورت طویل خطوط بھی لکھے ہیں اورمختصر بھی۔ان کے مکاتیب میں حقیقت نگاری، صداقت پسندی اورخلوص کی جھلک ملتی ہے۔

## رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی کے اب تک چھے سات مجموعے ہائے مکاتیب شائع ہوئے ہیں۔ان کے خطوط میں ہر جگہ ان کا مخصوص اور منفرد انداز نگارش نمایاں رہتا ہے۔بعض خطوں میں انھوں نے اپنے معاصرین پر کھل کر اعتراضات کیے ہیں۔بعض جگہ طنز بھی کیا ہے اور بعض کی تعریف وتوصیف بھی ہے۔مکتوب نگاری رشید صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد غالباً انھوں نے ہی سب سے زیادہ خطوط لکھے ہیں۔

## اپنی معلومات کی جانچ

**جوڑ ملایئے۔**

| | |
|---|---|
| ۱۔اُردوئے معلّٰی | مہدی افادی |
| ۲۔ انشائے سُرور | مرزا غالب |
| ۳۔غبارِ خاطر | علامہ شبلی نعمانی |
| ۴۔مکاتیبِ مہدی | رجب علی بیگ سرور |
| ۵۔خطوطِ شبلی | مولانا ابوالکلام آزاد |

## 1.8 خلاصہ

مکتوب نگاری غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔خط یا مکتوب دو آدمیوں کے درمیان فاصلے کی وجہ سے کی گئی تحریری گفتگو کا نام ہے۔خط عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''لکیر'' یا ''تحریر'' کے ہیں۔زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ لفظ خط کے معنی ومفہوم میں بھی تبدیلی آئی اور یہ لفظ مکتوب یا نامہ کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔

خط دراصل دو افراد کے مابین ترسیل خیال کا ایک وسیلہ ہے جس میں ایک شخص دور رہنے والے شخص تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔خطوط کے ذریعے دو اشخاص کے درمیان موجودہ تعلقات وحالات سے جانکاری ملتی ہے۔اس طرح خط یا مکتوب کے ذریعے دو لوگ آپس میں ربط قائم کر سکتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے خط کو آدھی ملاقات بھی کہا جاتا ہے۔

خط لکھنے والے کو خطوط نویس، کاتب یا مکتوب نگار کہتے ہیں اور جس کو خط لکھا جارہا ہے اسے مکتوب الیہ کہتے ہیں۔ کاتب اور مکتوب الیہ کے تعلقات کا اظہار جس تحریر میں ہوگا اسے مکتوب نگاری کہتے ہیں۔خطوط وہ تحریریں ہیں جن میں مکتوب نگار اپنے خیالات وجذبات کو قلمبند کر کے مکتوب الیہ کو بھیجتا ہے۔ایک خط میں حسبِ ذیل اجزاء ہوتے ہیں:

mynotes.in

1۔سرنامہ 2۔القاب وآداب 3۔نفسِ مضمون 5۔اختتامی کلمات

6۔معجز بیانی 7۔مکتوب الیہ کا پتہ

اُردو میں خطوط نگاری کے مختلف طریقہ رائج ہیں۔موضوع اور مخاطب کے اعتبار سے خطوط کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ چناں چہ خطوط کو حسبِ ذیل اقسام میں پیش کیا جاسکتا ہے:

1۔نجی خانگی خطوط 2۔سرکاری خطوط 3۔کاروباری خطوط

4۔اخباری خطوط، 7۔درخواست، 8۔رقعہ جات وغیرہ۔

مکتوب یا خط صرف ایک تحریر کی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسے صاف اور شفاف آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں صاحبِ تحریر کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نمایاں ہوجاتی ہے۔کسی بھی شخصیت اور اس کے مزاج وکردار کے نفسیاتی اور تجزیاتی مطالعے کے لیے اس کی تخلیقات سے کہیں زیادہ مکاتب معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔ادب میں خطوط کئی حیثیتوں سے اہمیت کے حامل ہیں۔خطوط کی لسانی، تاریخی، سوانحی، علمی وادبی اہمیت مسلم ہے۔ اس کے علاوہ خطوط مکتوب نگار کے احساسات وجذبات وافکار وخیالات، شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کو سمجھنے میں معاون ومددگار ہوتے ہیں۔

اُردو میں نثری صنف کی حیثیت سے خطوط نگاری کا آغاز مرزا غالب کی تحریروں سے ہوا۔غالب کے خطوط میں سادگی اور بے ساختہ پن کی وجہ سے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔شاعری میں غالب جس قدر مشکل پسند ہیں وہ اپنے خطوط میں اسی قدر آسان پسند نظر آتے ہیں۔غالب کے بعد اردو کے بیشتر شاعر اور ادیب کے خطوط اشاعت پذیر ہونے لگے۔سرسید اور ان کے نامور رُفقاء کے خطوط شائع ہوچکے ہیں۔چوں کہ خطوط آپسی تعلقات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اس لیے خطوط کے مواد سے زیادہ اسلوب کی اہمیت ہوتی ہے۔خیالات کی پیشکشی میں روانی اور تسلسل کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی چاشنی برقرار رہے تو ایسے خطوط اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔اُردو میں ادبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیتوں کے خطوط شائع ہوچکے ہیں۔سرسید احمد خان کے خطوط اردو نثر میں اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ ایک مصلح کی حیثیت سے انھوں نے احباب کو خطوط لکھے۔ان کی شخصیت کا پَرتو ان کے خطوط میں ان کے تاریخی شعور کا وجدان محسوس کیا جاسکتا ہے۔مولانا حالی کے خطوط میں اصلاحی رجحان کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط ''غبارِ خاطر'' میں انشا پردازانہ اسلوب جھلکتا ہے۔مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور علامہ اقبال کے خطوط میں قومیت اور حریت کے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔اردو میں منظوم خطوط کے علاوہ خواتین کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔خواتین کے خطوط میں نسائی حسیت کا پَرتو دکھائی دیتا ہے۔''غبارِ خاطر'' کی انشا پردازی کے مقابل صفیہ اختر کے ''زیرِ لب'' کے

خطوط ایک فراق زدہ شوہر پرست خاتون کے جذبات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

## 1.9 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ خط کی تعریف بیان کیجیے؟

۲۔مکتوب نگاری کے اقسام بیان کیجیے؟

۳۔ خط کے اجزاء بیان کیجیے؟

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جواب لکھیے۔

۱۔ مکتوب نگاری کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اقسام پر نوٹ لکھیے؟

۲۔ اُردو میں مکتوب نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالیے؟

۳۔اُردو کے چند اہم مکتوب نگاروں کا تعارف کرائیے؟

## 1.10 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| ترسیل | = | بھیجنا۔روانہ کرنا |
| عجز وانکساری | = | عاجزی وفروتنی |
| محظوظ ہونا | = | لطف اندوز ہونا |
| معاصرین | = | ہم عصر۔ہم زمانہ لوگ |
| مراسلہ | = | خط |
| اسلوب | = | انداز۔طرز |
| تصنع | = | بناوٹ |
| تعجیل | = | عجلت۔جلدی |
| زودنویس | = | تیزی سے لکھنے والا۔جلد لکھنے والا |
| نگارش | = | تحریر |

munotes.in

## 1.11 سفارش کردہ کتابیں

| | |
|---|---|
| 1۔اُردو خطوط کا مطالعہ | ساحل احمد |
| 2۔اُردو میں ادبی نثر کی تاریخ | ڈاکٹر طیبہ خاتون |
| 3۔اُردو خطوط نگاری ایک مطالعہ | ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر |
| 4۔اُردو نثر اصناف و اسالیب | قمر الہدی فریدی |
| 5۔خطوط عبدالحق | عبادت بریلوی |
| 6۔خطوطِ غالب | خلیق انجم |

☆☆☆

munotes.in

# اکائی: ۲۔ اردو مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا

ساخت:


2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 خط کی تعریف اور اہمیت وضرورت

2.4 مکتوب نگاری: غالب سے پہلے

2.5 مکتوب نگاری: غالب تا حال

2.6 خلاصہ

2.7 نمونۂ امتحانی سوالات

2.8 فرہنگ

2.9 معاون کتابیں

2.10 حواشی


## 2.1 اغراض ومقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد طلبا کے اندر مندرجہ ذیل تبدیلیاں رونما ہونگی:

1۔ طلبا اردو میں مکتوب نگاری کے آغاز وارتقا اور اس کی اہمیت وضرورت سے واقف ہوسکیں گے۔

2۔ طلبا مکتوب نگاری میں غالب کی انفرادیت سے واقف ہوسکیں گے۔

3۔ طلبا مکتوب نگاری کے زوال کے اسباب کی بازیافت کرسکیں گے۔

4۔ طلبا سرسید، مولوی عبدالحق، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری اور فیض احمد فیض کی مکتوب نگاری سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

5۔ طلبا اس سبق کی تکمیل کے بعد اس قابل ہوجائیں گے کہ اردو میں مکتوب نگاری کی روایت اور اس کے خدوخال سے کما حقہ واقف ہوجائیں گے۔

6۔ طلبا غالب سے پہلے اردو میں مکتوب نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرسکیں گے۔

munotes.in

## 2.2 تمہید

خط کا لکھنا اور پڑھنا ایک سماجی عمل ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ انسان سماج سے علاحدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہر انسان کے دوسرے انسانوں سے مختلف نوعیت کے روابط ہوتے ہیں۔ انسانی رشتوں کی ابتدا گھر اور خاندان سے ہوتی ہے، پھر دوستی کا رشتہ ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں الگ الگ رشتے قائم ہوتے ہیں جیسے استاد اور شاگرد کا رشتہ، کارخانے کے مالک اور مزدور کا رشتہ۔ تاجر اور خریدار کا رشتہ ایسے بہت سے رشتے ہیں جنھیں قائم رکھنے اور مستحکم بنانے میں خط و کتابت اور مراسلت کا بھی دخل ہوتا ہے۔

جب کسی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تو وہ خطوط کے ذریعے ربط پیدا کرتے ہیں۔ خطوط ملاقات کا بدل بن جاتے ہیں اسی لئے خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ دراصل خطوط کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے۔ دفاتر کے درمیان مراسلت ہوتی ہے مختلف اغراض و مقاصد کے لئے لوگ درخواستیں لکھتے ہیں۔ اخبار کے قارئین مختلف مسائل پر اپنے خیالات اور رایوں کا اظہار کرتے ہیں اور شکایتیں لکھ بھیجتے ہیں۔

مکاتیب سیاسی، اطلاعاتی، اور عام معلوماتی بھی ہو سکتے ہیں اور تجارتی و کاروباری، سرکاری و دفتری بھی یا شخصی اور ذاتی نوعیت کے بھی۔ اسی لئے خطوط یا مکاتیب کی بھی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں، جیسے تجارتی یا کاروباری خطوط، سرکاری و دفتری خطوط اور شخصی و ذاتی خطوط۔ اس اکائی میں جن خطوط سے سروکار ہے وہ ذاتی یا شخصی خطوط ہیں۔

موجودہ دور میں نئے نئے سائنسی ایجادات انقلابات نے ہماری خطوط نویسی کی روایت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ٹیلی فون ٹیلی گرام کی ایجاد نے ابتداً مکتوب نگاری کے نظام پر کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کیے لیکن عصر حاضر میں سائنس کی ترقی نے ہماری تہذیب و تمدن اور خیالات کی ترسیل کے طور طریقوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ تغیر و تبدل کی رفتار میں تیزی آ گئی اور ہر دنیا تجربہ یا نئی ایجاد پلک جھپکتے ہی ماضی کا حصہ بننے لگی۔ مختلف علوم و فنون کے پہلو بہ پہلو ترسیل و ابلاغ کے بھی نئے نئے اور سہولت بخش ذرائع جیسے کمپوٹر، انٹرنٹ، فیکس، موبائل فون منظر عام پر آنے لگے جن کی وجہ سے مکتوب نگاری کی روایت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔

## 2.3 خط کی تعریف اور اہمیت و ضرورت

خط یا مکتوب نگاری کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خط کے معنی و مفہوم سے بھی واقفیت حاصل کی جائے۔ ''خط'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ''لکیر''، ''سطر'' یا تحریر کے ہیں۔ زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ لفظ ''خط'' کے معنی و مفہوم میں بھی تبدیلی آئی اور یہ لفظ مکتوب یا ''نامہ'' کے معنی و مفہوم میں بھی مستعمل

ہونے لگا۔خط یا مکتوب دراصل دوافراد کے مابین ترسیلِ خیال کا ایک وسیلہ ہے۔جس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ dictionary of world literature میں خط کی تعریف کرتے ہوئے شپلے (shipley) نے لکھا ہے:

''خط عام طور سے مکتوب نگار (پہلا آدمی) اور مکتوب الیہ (دوسرا آدمی) کے بیچ تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے''۔

خطوط عموماً صیغۂ واحد متکلم میں ہوتے ہیں۔ان میں روزمرہ کی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن کا تعلق مکتوب نگار یا مکتوب الیہ کی ذات سے ہوتا ہے۔خطوط میں بے ربطی اور منتشر خیالی کے ساتھ کبھی ذاتی اور کبھی سیاسی ،سماجی ،مواشرتی ،اور تہذیبی اشارے بھی ملتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر خورشید اسلام:

''خط حسن اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں دنیا کا لطف ہے''۔

(تنقیدیں۔ص۹)

مکتوب نویسی اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جہاں لفظ بولتے ہیں اور مکتوب نگار کا حالِ دل مکتوب الیہ کو سناتے ہیں یہاں خاموشی زبان بن جاتی ہے اور دونوں جانب کی نجی زندگیاں کاغذ کی اسکرین پر نمایاں ہوجاتی ہیں۔کسی اور صنف میں یہ خصوصیت بہت کم پائی جاتی ہے کہ وہ عرض حال کا نقشہ ہو بہو اتار دے اور ایک ایک بات مکتوب الیہ تک پہنچا دے کیوں کہ مکتوب نگار اسے انتہائی توجہ اور فکر سے لکھتا ہے،اس لیے بہت سی ایسی باتیں بھی ان میں در آتی ہیں جنھیں عام اصناف میں نہیں کہا جا سکتا۔مکتوبات کی یہ دنیا زندگی سے بھرپور، بڑی دل چسپ اور دل نشیں دنیا ہوتی ہے۔ ان خطوں کی مدد سے تاریخ،ادب،سوچ وفکر،نظر ونظریہ کے بہت سے گوشے وا ہو سکتے ہیں اسی طرح پوری شخصیت کے سارے پہلو واضح نہ سہی، کچھ اہم اور کارآمد پہلو ضرور سامنے آجاتے ہیں اور ادیبوں کی نجی زندگیاں،معاملات، کیفیات و مشکلات ومصائب کا کچھ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔خطوط کی مدد سے تاریخ کے گنجلک واقعات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔اسی طرح ان سے مذہبی، سیاسی، عسکری، سفارتی حالات پر بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔نیز اس عہد کے علمی وادبی معاملات و سروکار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس بات کی تحقیق اور اس بابت گفتگو اب لاحاصل اور حاصل تحصیل ہے کہ مکتوب یا خطوط نگاری کی ضرورت

کیوں پڑی اور کیوں کر اس سلسلے کا آغاز کیا گیا۔ کیوں کہ بدیہی اور نظری بات یہ ہے کہ زمانی اور واقعاتی ضرورتوں نے اسے جنم دیا۔ جس طرح دیگر اہم چیزوں اور روایتوں کو جنم ملا ہے۔ اسی بات کو یوں بھی کہا اور سمجھا جا سکتا ہے کہ جب انسان نے باہمی رابطوں کے ذرائع پر غور کیا اور اسے اپنا مخاطب کہیں نظر آیا جسے وہ دیکھ نہیں سکتا ہے یا اس تک اپنی فطری آواز نہیں پہنچا سکتا تو اس نے خط نگاری کا سہارا لیا۔ چوں کہ دو یا چند افراد کے درمیان باہمی گفتگو ایک سماجی عمل اور ضرورت ہے مگر جب یہ ناممکن ہو یعنی مخاطبین روبرو نہ ہوں تو ہمیں اپنے خیالات کے لیے تحریر یا خط کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خط نگاری کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کبھی کبھی کھل کر بات کہنے کے بجائے رازداری سے باتیں کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے، اس لیے اس رازداری کے قصد کی غرض سے اسے اختیار کیا جاتا ہے لہٰذا حضرت انسان نے منجملہ دیگر سلسلوں کے اسے بھی دریافت کیا۔ حالاں کہ ابتدا میں یہ پُرخطر معاملہ رہا ہوگا، کیوں کہ اس وقت نہ تو کاغذ تھے اور نہ دیگر چیزیں کہ خط کی محفوظ طریقے سے ترسیل ممکن ہو، تاہم نامہ بر پر اعتماد اور بھروسہ موجود تھا کہ وہ اس راز کو افشا نہ کرے گا اور اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے گا۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات انسانی تاریخ میں بکثرت موجود ہیں۔ اس کے بعد وقت نے کروٹ بدلی اور اور جدت و ترقی پسند انسان نے ایجادات و ترقیات کے دروازے کھول دیے جن میں سے نت نئی اور کارآمد چیزیں اس طرح نکلنے لگیں جیسے جادوگر کی ٹوپی سے حیران کن چیزیں برآمد ہوتی ہیں۔

مکتوب نگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ماضی کے امرا و سلاطین نے اپنے درباروں، کابینہ، سلطنت میں باضابطہ خطوط نگاری کا ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا جس میں خطوط نگاری کی تعلیم و تربیت کے مختلف درجے اور شعبے قائم تھے اور تربیت و تعلیم کے لیے اساتذہ و ماہرین بھی مقرر تھے۔ اسی طرح ان کے شعبۂ نشر و اشاعت میں سینکڑوں منشی، کاتب اور ترجمہ نگار ہمہ وقت خطوط نگاری کے امور و عہدوں پر متعین تھے۔ ریاست کے اہم اور قابل ذکر مقامات پر ڈاک خانے، سرائیں اور ہرکاروں کے دفاتر قائم کر رکھے تھے۔ یہ خطوط مختلف نوعیت کے ہوتے تھے جن میں دوسرے ممالک اور ریاستوں سے تعلقات، فوجی اور عسکری کوائف، جاسوسی اور خفیہ پیغام رسانی کے امور خاص طور سے ہوتے تھے۔ ان اجتماعی خطوط کے علاوہ انفرادی طور پر بھی مختلف نوعیت کے خطوط لکھے جاتے تھے۔

مشاہیر اور ماقبل خطوط نگاروں کے خطوط کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط اور مکتوبات کو تاریخ، ادب، انشا، فلسفہ، عمرانیات، ایمان و تصوف، عقائد و نظریات، تہذیب، ثقافت، تمدن اور درخشاں اقدار و روایات جیسے بامقاصد عناصر و خوبیوں سے مالا مال کیا ہے۔ اسی لیے تو ان میں علوم و فنون کے بحر ذخار بہتے ہیں۔ اس صنف نے چمنستان ادب کو رنگ، خوش بو اور حسن و خوبی کے بے شمار استعاروں، لاتعداد رنگینوں، رعنائیوں، دل چسپیوں اور دلکش کیفیات کی پھول پتیوں سے سجایا ہے۔ خطوط نگار، اُن مختصر عبارتوں میں نئے نئے امکانات، ارتعاشات اور ممکنات کی

تلاش وجستجو کرتا ہوا اس دریا سے نایاب ہیرے جواہرات نکال کر لاتا ہے۔اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ہر صنف ادب کی دلکشی و دل فریبی اپنی جگہ،لیکن جو تاثیر، بے تکلفی اور جو مسحور کن اثر آفرینی اس صنف یعنی مکتوب نگاری میں پنہاں ہے،اس میں کوئی اور صنف ادب،اس کی شریک و ساتھی اور مقابل نہیں ہے۔میرا خیال اس وقت اور پختہ ہو جاتا ہے جب اس کی تائید عظیم مکتوب نگاروں کی باتوں سے ہوتی ہے۔

صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

''ادب میں سینکڑوں دل کشیاں ہیں۔اس کی بے شمار نگاہیں اور ان گنت راہیں ہیں لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بشرطیکہ لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔''(۱)

دوسری مکتوب نگار، پروفیسر صغریٰ مہدی لکھتی ہیں:

''خطوں میں انسان ایک دوسرے انسان سے زبان قلم سے باتیں کرتا ہے۔دنیا بھر کی باتیں،اپنی باتیں،اس کی باتیں[اُس کی باتیں]رسمی باتیں،دل کی باتیں۔یہ باتیں اگر تصنع اور بناوٹ بھری نہ ہوں تو وہ سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔''(۲)

صغریٰ مہدی مزید لکھتی ہیں:

''شاعری کی طرح مکتوب نگاری بھی اکتسابی نہیں بلکہ اس کا ملکہ قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے ورنہ خط تو سبھی لکھتے ہیں مگر ایسے مکتوب نگار کم ہیں جن کے خطوط ادب میں مقام پا سکیں۔''(۳)

مرتب خطوط غالب،ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے:

''خط شخصی چیز ہے۔اس میں صرف ایک آواز ابھرتی ہے اور وہ ہے مکتوب نگار کی آواز جو سو فی صد ذاتی ہوتی ہے۔یہ آواز مکتوب نگار کی دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے،اس آواز سے بھی جو مکتوب نگار کی سماجی آواز ہوتی ہے اور اس آواز سے بھی جو اس کے تخلیقی فن میں گونجتی ہے۔یہ آواز ایسے انسان کی ہوتی ہے جو عظیم فن کار ہوتے ہوئے بھی ایک عام انسان ہے اور عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا،جاگتا اور سوتا ہے،جو خلوت کدے میں اپنے چہرے اور تہہ در تہہ شخصیت پر سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔اگر مکتوب نگار کو زندگی کا فہم و ادراک ہے،اگر نبض کائنات پر اس کی انگلیاں ہیں اور اس کی ژرف نگاہی انسانی نفسیات کے پیچ و خم سے واقف ہے تو اس کی آواز آفاقی اور غیر فانی بن جاتی ہے۔''(۴)

ایک باصلاحیت مکتوب نگار ذاتی اور شخصی رویے کو جس فنی مہارت سے آفاقی نہج اور منزل عطا کرتا ہے،وہ اسے ابد

آشنا بنانے کا وسیلہ ہے۔اسی طرح وہ صاحب طرز اور صاحب اسلوب بھی بن جاتا ہے اسی طرح نئے طرز و اسلوب کا موجد و مولد بھی۔

خط اصلاً نجی ہوتے ہیں۔اس کے باوجود یہ اپنے اندر آفاقیت اور اجتماعیت کا عنصر رکھتے ہیں۔خط کا حسن اس کے اختصار میں پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا اوّلین مقصد ابلاغ کامل ہے۔وہ خطوط بہتر سمجھے جاتے ہیں جن میں بے ساختگی، سادگی، سلاست، بے تکلفی، قطعیت، لطافت اور بول چال کا انداز ہو۔بظاہر آسان نظر آنے والا یہ فن اس لیے مشکل ہے کہ ہر مختصر، سادہ اور بے تکلف تحریر، خط نہیں کہلائی جاسکتی۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں:

''اعلیٰ خط تہذیب نفس اور حسن کلام کا غیر معمولی آمیزہ ہوتا ہے۔''(۵)

گویا خط وہ تحریر ہے جس میں تہذیب، شائستگی، ایجاز، دلچسپی، شرافت، ٹھہراؤ، رچاؤ سبھی کچھ ہوتا ہے اور اچھا مکتوب نگار اپنے اسلوب کی جدت سے اس میں رنگ بھر دیتا ہے۔

خط انسانی جذبات و احساسات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ بن جاتے ہیں۔اور انسانی شخصیت کا وہ ساتواں دَر ہوتے ہیں جن تک پہنچے اور داخل ہوئے بغیر فطرت کے اسرار و رموز کو نہیں سمجھا جاسکتا۔انسانی تہذیب نے مکاتبت و مراسلت کو بڑی اہمیت دی ہے۔اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اس شخص کو شائستہ اور مہذب سمجھا جاتا تھا جو خط لکھنے کے فن میں طاق ہو۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ خط کی تعریف کیجیے۔

۲۔ خط کیوں لکھے جاتے ہیں؟

۳۔مکتوب کے لغوی معنی لکھیے۔

۴۔ خط کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

## 2.4 مکتوب نگاری: غالب سے پہلے

خط و کتابت اور ان کے ذرائع کا آغاز تو ابتدائے آفرینش میں ہی ہو چکا تھا۔خود اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے اپنے نبیوں اور برگزیدہ بندوں تک پہنچایا۔یہیں سے ترسیل، مراسلہ نگاری، خط، پیام اور پیغام رسانی کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔یہ سلسلہ بتدریج ترقی اور عروج کی شکلیں اختیار کرتا چلا گیا۔پھر لساناً بلسانٍ اور ایک

کلچر سے دوسرے کلچر میں متعدد شکلیں وصورتیں اختیار کر کے پروان چڑھتا گیا۔

جب بات کی جاتی ہے خط یا مکتوب نگاری کے آغاز کی تو ماہرین لسانیات، ماہرین ادب اور علما و محققین کی تحقیقات کے مطابق یہ بات اب تسلیم کی جا چکی ہے کہ خط یا مکتوب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود تحریر کی تاریخ ہے۔

خطوط نگاری انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا کا فن ہے۔ یہ فن اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سکھایا ہے۔ اس ذات باری نے ان کے ترقی پسند اذہان میں یہ بات ڈالی کہ تم اپنے رابطوں کے ذرائع میں اس طریقے کو بھی اختیار کرو۔ اس نے قلم کو پیدا کیا اور اس کی حرمت دلوں میں بٹھائی۔ چنانچہ یہ فن انسانی رشتوں اور باہمی تعلقات میں ان کے معاملات سے بحث کرتا ہے۔ اس کی غرض و غایت یہی ہے کہ ان کے ذریعے انسانوں کے احوال وکوائف انسانوں تک پہنچیں۔ اس فن کے قالب میں آپسی تعلقات، گردوپیش کے واقعات وحالات تو کبھی خالص ذاتی نوعیت کے معاملات اور کبھی علمی وفکری مباحث جگہ بناتے ہیں اور اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ خطوط نگاری ایسا فن ہے جو سماج میں بسنے والے انسان، ان کی فکر، رویہ، آپسی لین دین، مختلف سیاسی، ادبی اور سماجی ایشوز پر مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے خیالات و احساسات پر مبنی براہ راست ایسا منضبط اور مبسوط دستاویزی حوالہ بنتا ہے جس میں اس عہد کی معاشرتی زندگی، رہن سہن، رسم ورواج، سیاسی اتھل پتھل، تہذیبی شکست وریخت، علمی وادبی مباحث اور فکری احوال وکوائف نمایاں طور پر موجود ہوتے ہیں۔

یہ ایک ایسی بے ریائی تحریر ہے، جس میں انسانی شخصیت پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے۔ اس میں مرزا غالبؔ اکثر فکر معاش میں مصروف نظر آتے ہیں تو سرسید احمد خاں قوم کی تعلیم، اس کی فکر، اس کی نشاۃ ثانیہ اور اس کی گہری نیند سے بے داری کی تگ ودو کرتے نظر آتے ہیں، اسی طرح شبلی اور اقبال جیسی قدآور شخصیات کو کسی پری وش پہ جاں نثار ہوتے دیکھا جا سکتا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور زنداں کی دیواروں کے سہارے ٹیک لگا کر چائے کی ثنا خوانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فن خطوط نگاری انسان کے تعلیم وتربیت یافتہ ہونے کا احساس بھی کراتا ہے اور اس کی عقل ودانش کی دلیل بھی بنتا ہے۔

اردو میں خطوط نگاری کی جب بات کی جاتی ہے تو ایک ایسی صنف کا تصور آتا ہے جو اپنے تئیں مضبوط بھی ہے اور کشاں کشاں بڑی اصناف ادب میں بھی شمار کی جاتی ہے بلکہ اسے اردو ادب میں باقاعدہ ایک فن یا ادب لطیف کی حیثیت حاصل ہے۔ فنون لطیفہ میں تو اس کا شمار پہلے دن سے ہی ہے۔ خطوط میں، خط نگار، مکتوب الیہ سے اپنے ذاتی حال احوال بیان کرتے کرتے موجودہ سیاسی، سماجی، موسمی اور فطری کیفیات کا اظہار کرنے لگتا ہے اور پھر اس کے مطابق مکتوب الیہ کے تمام احوال وکیفیات موصول کرتا ہے۔ یعنی خطوط نگاری اور خطوط موصولی، شخصی اظہار کا ایک بھروسے مند اور لازوال

ذریعہ ہے۔ بے شمار کلام فکر، خطوط کے ذریعے احباب و متعلقین تک چلے جاتے ہیں اور ان کے حاصل ہو جاتے ہیں۔ اردو میں خطوط نگاری کا رواج، چلن فارسی کی تقلید میں ہوا اور ابتدا میں فارسی کی ہی تتبع میں وہی اسلوب اپنایا گیا جو اس کی خصوصی شناخت ہے یعنی مقفّیٰ و مسجع عبارت آرائی اور پر شکوہ کلمات نوشتہ راز بن کر، اسی طرح پر تکلف آداب والقاب، بعد ازاں اردو اپنے قدیم اور ازلی easy track پر آ گئی، جو اس زبان کا بنیادی عنصر ہے۔ پھر یہ سلسلہ بقدر ضرورت اور بہ تقاضائے وقت، مشکل سے آسان، آسان سے سہل اور سہل سے سہل تر ہوتا گیا۔ پھر تو اسے ہر ادیب اور شاعر اپنے فن اور فکر کا حصہ بنانے لگا اور منجملہ اپنے دیگر کلام و افکار کے، مکتوب نگاری میں بھی اپنی انفرادیت و اہمیت کے ثبوت بہم پہنچانے لگا۔

جہاں تک اردو میں خطوط یا مکتوب نگاری کا تعلق ہے تو فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بھی بہت پہلے سے اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ عام طور پر رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث بے خبر کو اردو کا پہلا مکتوب نگار کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر عبد اللطیف اعظمی نے امتیاز علی عرشی کے حوالے سے اپنے مقالہ ''اردو مکتوب نگاری'' میں بعد از تحقیق یہ بات ثابت کی ہے کہ کرناٹک میں ارکاٹ کے نواب والا جاہ کے چھوٹے بیٹے، حسام الملک بہادر نے اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم کے نام 6 دسمبر 1822 کو خط لکھا تھا۔ امتیاز علی عرشی کی تحقیق کے مطابق یہ اردو کا پہلا خط ہے۔ پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر عنوان چشتی نے بھی اس تحقیق کی تائید کی ہے۔

امتیاز علی عرشی کا بیان ہے:

> ''جہاں تک اردو مراسلت کا تعلق ہے تو صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک سب سے پرانا خط جو ملا ہے، وہ 21 ربیع الاول 1238 مطابق 6 دسمبر 1822 کا نوشتہ ہے۔ اس کے کاتب نواب حسام الملک بہادر جو کرناٹک کے نواب والا جاہ بہادر کے چوتھے بیٹے ہیں اور مکتوب الیہ ان کی بڑی بھاوج نواب بیگم ہیں۔'' (۷)

اس کے علاوہ بھی عبد اللطیف اعظمی نے دو تین اور خطوط کا ذکر کیا ہے جو اسی دور میں لکھے گئے ہیں۔ جیسے شکوہ الملک ثانی نصیر الدولہ دلیر جنگ اور مکتوب الیہ ان کی بیٹی نواب بیگم ہیں۔ ایک دوسرا خط بھی مذکورہ شاہ صاحب سے منسوب کیا گیا ہے جو 1816 میں لکھا گیا تھا۔ تاہم چوں کہ ان خطوط کی امتیاز علی عرشی اور دیگر محققین نے تاریخی طور پر تردید کی ہے، لہٰذا ان خطوط کا ذکر ضمن میں آیا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مضمون ''غالب اور شاہانِ تیموریہ'' میں جان طپش (م 1814) اور راسخ عظیم آبادی (م 1822) دونوں کی باہمی مراسلت کا تذکرہ کیا ہے اور دونوں کے خطوط دریافت بھی ہوئے ہیں یعنی ظاہر ہے یہ خطوط 1814 سے پہلے کے ہیں تو ان کی قدامت ثابت ہو جاتی ہے۔ پروفیسر ثریا حسین کی تحقیقی تصنیف ''گارساں دتاسی اردو

خدمات اور علمی کارنامے'' میں انھوں نے دتاسی کی کتاب ''ضمیمۂ ہندوستانی مبادیات'' کا تعارف کروایا ہے۔اس میں گارساں دتاسی نے اردو کے 18 خطوط شامل کیے ہیں جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لکھے گئے۔اس میں قدیم ترین خط جنوری 1810 کا ہے۔مکتوب نگار افتخار الدین علی خان شہرت (جو کبھی فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے) ہیں جبکہ مکتوب الیہ کوئی منشی ہے۔علاوہ ازیں حیدرآبادی شاعر، شیر محمد خان ایمانؔ کی کلیات 1806 میں شائع ہوئی جس میں ایک منظوم خط ہے جو کسی نثری مکتوب کے جواب میں ہے۔مزید یہ کہ ایمانؔ سے بھی بہت پہلے یعنی 1761 میں حیدرآباد کے دو منصب دار، مرزا یار علی بیگ اور میر ابراہیم جیوان دونوں کے ایک دوسرے کے نام منظوم خطوط دریافت ہوئے ہیں جو 1761 میں لکھے گئے۔ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے کتب خانے میں یہ خطوط محفوظ ہیں۔

اردو مکتوب نگاری کو اہمیت بہر حال غالب کی مکتوب نگاری سے حاصل ہوئی بلکہ اسے اردو مکتوب نگاری کے عہد نو سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اگر چہ غالب سے پہلے 1886 میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے ''انشائے سرور'' کے نام سے مجموعۂ مکاتیب شائع کیا ہے۔ان خطوط کی عبارت بھی فسانہ عجائب ہی کی طرح ہے۔رجب علی بیگ سرور کے خطوط میں القاب وآداب اور تمہید میں روایتی طرز کی خطوط نویسی کا انداز ملتا ہے۔رنگین بیانی کا اہتمام بھی ملتا ہے اور الفاظ پُرشکوہ ہیں۔سرورؔ کی کوشش رہی ہے کہ عبارت گنجلک نہ ہونے پائے، بلکہ زبان سلیس اور اسلوب سادہ ہے۔اسلوب میں طنز و مزاح کی شگفتگی بھی ملتی ہے۔ان کے خطوط میں اکثر مکالمے کا انداز بھی ملتا ہے۔مثلاً ''قبلہ، بندہ تسلیم بجالاتا ہوں اور جو کام کرتا ہوں، اس کی داد پاتا ہوں، آپ کی پوسٹ ماسٹر تک رسائی ہے۔مَیں نے ہرکاروں سے رسم بڑھائی ہے۔گو ہم پلہ نہیں، کم ہوں مگر قدم بقدم ہوں۔''

سرورؔ کے زمانے میں معنی سے زیادہ الفاظ کی پذیرائی ہوئی۔انھوں نے جدید لفظوں کا انتخاب کیا۔ان کے استعمال کردہ لفظوں میں بہت کم اب متروک ہیں۔سرورؔ کو لفظ کی جدید شکلوں اور ان کے نادر استعمال پر قدرت حاصل تھی۔ان کی زبان لکھنؤ کی ادبی اور مجلسی اردو کا نمونہ پیش کرتی ہے۔بعد ازاں خواجہ غلام غوث بے خبر کے دو مجموعۂ مکاتیب ''فغان بے خبر'' اور ''انشائے بے خبر'' شائع ہوئے۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ غالب سے پہلے اردو میں مکاتیب کس نے لکھے؟

۲۔ ''انشائے سرور'' کے مصنف کا نام بتایئے؟

۳۔''انشائے بے خبر'' کس کے خطوط کا مجموعہ ہے؟

۴۔ اردو میں خطوط نویسی کی ابتدا کب ہوئی؟

## 2.5 مکتوب نگاری: غالب تا حال

یہ بات پوری اردو دنیا تسلیم کرتی ہے کہ مرزا غالب ہی اردو کے سب سے بڑے مکتوب نگار ہیں اور ان ہی کے دور سے اردو مکتوب نگاری کے جدید عہد کی ابتدا ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ سہرا بھی مرزا غالب کے ہی سر ہے کہ انھوں نے خطوط نگاری کے اصول و آداب، ضوابط و قواعد اور انداز و اسالیب متعین کیے۔ مرزا غالب نے ان خطوط میں سلاست، روانی، تازگی، برجستگی، بے ساختگی، شگفتہ بیانی، بے تکلفی اور روزمرہ کی بولی و زبان جیسی خوبیوں کو برتا اور ایجاد کیا۔

انھوں نے سب سے بڑی بات خط کو آدھی ملاقات قرار دے کر بتلایا کہ مراسلے کس طرح مکالمہ بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں اور متعلقین کو لکھے گئے متعدد خطوط میں فخریہ اور برملا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے ''مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔'' وہ کہتے ہیں:

> ''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔'' (۸)

غالب کی یہ بات سچ بھی ہے جس کا اندازہ ان کے خطوط کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سامنے یا پاس ہی بیٹھا ہے اور وہ اسے چپکے چپکے حال دل، کیفیات دل اور عرض حال سنا رہے ہیں۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان مکاتیب میں غالب نے قدیم طریقہ القاب و آداب استعمال نہیں کیا، انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا اور مروجہ مقفّیٰ و مسجع اسلوب و عبارات آرائی کے مظاہرے کے بجائے سادہ، عام فہم اور سلیس اسلوب تحریر ایجاد کیا۔ خطوط کی اُن خصوصیات پر زور دیا جن کا تعلق خطوط کے موضوعات سے ہے اور بے جا لفظیات یا غیر ضروری چیزوں سے انھیں پاک کیا۔ انھوں نے القاب و آداب اور بے جا تعریفیں بھی حذف کیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے ان کا استعمال بالکل نہیں کیا۔ بلکہ بوقت ضرورت بھی القاب و آداب لکھے ہیں وہ چھوٹوں کو مہاراجہ، سید صاحب، میاں صاحب، میری جان وغیرہ لکھتے تھے، اپنے ہم عمر لوگوں کو اکثر و بیشتر پیر و مرشد، بندہ پرور، جناب عالی، قبلہ و کعبہ وغیرہ لکھ کر مخاطب کرتے تھے اور کئی لوگوں کی سماجی حیثیت سے مرعوب ہو کر انھوں نے طویل اور پر تصنع القاب بھی لکھے ہیں۔

اردو دنیا آج تک اس بات پر متحیر ہے کہ مرزا غالب شاعری میں جس قدر مشکل پسند تھے، مکتوب نگاری میں اتنے ہی سادہ اور سہل انداز تھے۔ ان کے بے شمار خطوط دستیاب ہوئے ہیں اور متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جیسے ''مہر غالب'' مرتبہ عبد الغفور سرور (1862ء) ''انتخاب غالب'' (1866ء) ''عودِ ہندی'' مرتبہ منشی ممتاز علی خاں (1868ء) ''اردوئے معلیٰ'' مرتبہ حکیم غلام رضا خاں (1869ء) ''مکاتیب غالب'' مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی (1937ء) ''ادبی خطوط غالب'' مرتبہ مرزا محمد عسکری (1939ء) ''خطوط غالب'' مرتبہ مہیش

پرشاد(1941ء)''نادرات غالب''مرتبی آفاق حسین آفاق(1949ء)''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر(1951ء)''غالب کی نادر تحریریں'' مرتبی خلیق انجم (1961ء)''غالب کے خطوط'' مرتبہ خلیق انجم (1984ء) کے علاوہ ان کے اور بھی خطوط مختلف رسالوں اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ان مجموعوں میں سب سے زیادہ شہرت ''عود ہندی'' اور اردوئے معلیٰ'' کو حاصل ہوئی اور ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ان خطوط پر محققین و تنقید نگاروں نے تحقیقی اور تنقیدی مقدمے اور نوٹس بھی لکھے ہیں اور ان کی اہمیت و معنویت کو بھی اردو دنیا و عالمی ادبیات کے سامنے اجاگر کیا ہے۔

مرزا غالب کے بعد تو اردو مکتوب نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور اسے اردو نثر کی ایک باضابطہ صنف سمجھا جانے لگا۔اردو نثر اور انشا نگاروں نے طرز غالب کو اپنا کر خوب اس صنف کو پروان چڑھایا اور بہ زبان قلم باتیں کر کے اسے جوان اور توانا بنایا۔

مرزا غالب کے بعد دورِ سرسید سے اردو مکتوباتی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔سرسید اور ان کے معاصر کے تحریر کردہ خطوط میں نئے زمانے کے رجحان،انگریزی زبان وادب کی ارتقائی منازل کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔اس دور کے مکتوب نگاروں کے خطوط ایک خاص طرز کی ترجمانی کرتے ہیں۔سرسید اور ان کے رفقا کے خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

بعد ازاں شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے خطوط کا مجموعہ ''مکتوبات آزاد'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔شمس العلما مولانا حالی کے خطوط کا مجموعہ ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے 1925 میں ''مکاتیب حالی'' کے نام سے شائع کیا مگر ہمارے عہد میں ''مکاتیب حالی'' مرتبہ اسماعیل پانی پتی موجود ہے۔علامہ شبلی نعمانی کے خطوط کے دو مجموعے ''مکاتیب شبلی'' اور خطوط شبلی کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔اول الذکر دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں سر سید،حبیب الرحمان خاں، پروفیسر عبد القادر،عبد الماجد دیابادی،ابو الکلام آزاد اور مہدی افادی کے نام خطوط شامل ہیں اور آخر الذکر میں عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم،ان دو خواتین کے نام خطوط ہیں۔

علامہ اقبال کا اردو و فارسی کلام،ان کے دانشوارانہ،مفکرانہ مقالات کے مجموعے کے ساتھ ان کے خطوط بھی فکر و دانش کا مرقع ہیں۔خطوط میں ان کی ادبی،علمی،سیاسی اور ذاتی شخصیت کے اہم پہلو نمایاں ہیں۔جن کا اظہار اس اکملیت کے ساتھ شاعری میں نہیں ہوسکا۔جناب مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے خطوط کو بڑی محنت اور جاں فشانی سے جمع کیا ہے اور انھیں ایک خاص ترتیب سے کلیات مکاتیب اقبال میں یکجا کیا ہے۔جس میں شاعر مشرق علامہ اقبال کے تمام اردو اور انگریزی خطوط تاریخی ترتیب اور ضروری تعلیقات وحواشی کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔اس تاریخی ترتیب سے کل خطوط کا مطالعہ کرنے سے اقبال کی سوانح نگاری کا کام بھی بہت سہل ہوجائے گا۔اس کے علاوہ ان خطوط کے مطالعے

سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اقبال خطوط نویسی میں کوئی اہتمام خاص نہیں کرتے تھے یعنی القاب بہت مختصر اور مکتوب الیہ کے رتبے کی رعات سے لکھتے تھے۔عبارت میں اختصار کے ساتھ جامعیت ہے۔عموما چھوٹے چھوٹے جملے،کبھی قلم برداشتہ،کبھی تاریخ مع ماہ وسال پوری ہوتی اور کہیں صرف ماہ اور تاریخ،بعض خطوط نہات ہی مختصر اور ذاتی ہیں،بعض علمی و ادبی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔اس طرح" کلیات مکاتیب اقبال "اقبال کی شخصیت وفن کو سمجھنے میں اہم ہے۔جس میں سید مظفر حسین برنی صاحب کا خطوط اقبال سے متعلق مستند مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ خطوط کئی جلدوں میں ہیں۔اس کے علاوہ مکاتیب اقبال سے متعلق اب تک درج ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

(۱) شادوا قبال مرتبہ ڈاکٹر زور(1942ء)۔(۲) اقبال نامہ مرتبہ عطاء اللہ حصہ اول (1945ء)۔ (۳)خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی (انگریزی)1947ء۔(۴)اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ دوم (1951ء)۔ (۵)مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خاں(1954ء)۔(۶) مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی(1957ء)۔ (۷)انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار(1967ء)۔(۸)Letters and writings of Iqbalمرتبہ بشیر احمد ڈار (1967ء)۔(۹) مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی (1969ء)۔(۱۰)نوادر اقبال بنام مہاراجہ کشن پرشاد مرتبہ عبداللہ قریشی (1975ء)۔(۱۱)خطوط اقبال مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔(۱۲)جہان دیگر مرتبہ فرید الحق۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے مکاتیب کے مجموعوں میں ''غبارِ خاطر'' کے خطوط کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور مجموعے کو نہ مل سکی۔غبار خاطر کے علاوہ مولانا کے خطوط کے اور بھی مجموعے'' کاروان خیال'' مکاتیب ابوالکلام''،''نقش آزاد''،''تبرکات آزاد''اور''میرا عقیدہ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

مولوی عبدالحق ممتاز نقاد اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زود نویس مکتوب نگار بھی ہیں۔وہ اپنے خطوط میں مطلب کی بات پر اکتفا کرتے ہوئے غیر ضروری امور سے اجتناب کرتے ہیں۔ان کی خطوط نویسی مدعا نگاری کی بہترین مثال ہے۔انہوں نے حسب ضرورت طویل خطوط بھی لکھے ہیں اور مختصر بھی۔ان کے مکاتیب میں حقیقت نگاری ،صداقت پسندی اور خلوص کی جھلک ملتی ہے۔مکاتیب عبدالحق کے اب تک درج ذیل مجموعے منظر عام پر آئے ہیں:

1. مکتوبات بابائے اردو بنام حکیم محمد امام امامی (1960ء)
2. مکاتیب عبدالحق مرتبہ خلیل قدوائی (1963ء)
3. مکتوبات بابائے اردو بنام پیر حسام الدین راشدی (1964ء)
4. Letters by Moulvi Abdul Haq(1966ء)
5. خطوط عبدالحق مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی (1967ء)
6. عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام مرتبہ افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق (1968ء)

7. خطوط عبدالحق بنام عبداللہ چغتائی مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی (1976ء)

مذکورہ بالا مجموعہ ہائے خطوط میں مولوی صاحب کے صرف چند سو خطوط شامل ہو سکے ہیں ورنہ مولوی عبدالحق کے مکاتیب کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے۔ان کے بے شمار خطوط ہنوز مختلف رسالوں، کتابوں، اور خانگی ذخیروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے اب تک چھ مجموعے ہائے مکاتیب شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ سلیمان اطہر جاوید نے شائع کیا ہے۔جس میں مسعود حسین خاں کے نام رشید احمد صدیقی کے خطوط یکجا کیے گئے ہیں۔دوسرا مجموعہ مکاتیب بنام خلیق احمد نظامی ہے۔تیسرا مجموعہ 'رقعات رشید احمد صدیقی' ہے۔چوتھا مجموعہ لطیف الزماں نے مرتب کیا ہے۔جس میں رشید احمد صدیقی کے بچوں کے نام لکھے گئے خطوط ہیں۔رشید احمد صدیقی کے خطوط میں ہر جگہ ان کا مخصوص انداز نگارش نمایاں ہے۔بعض خطوط میں انہوں نے اپنے معاصرین پر کھل کر اعتراضات کئے ہیں، بعض جگہ طنز بھی کیا ہے، اور بعض کی تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ان کے علاوہ سجاد ظہیر کے خطوط ''نقوش زنداں''، چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط ''گویا دبستاں کھل گیا''، فیض احمد فیض کے خطوط ''صلیبیں میرے دریچے میں''، فراق گورکھپوری کے خطوط ''من آنم'' اور ''معاصرین کے مکاتیب'' بنام محمد طفیل'' (مرتبہ جاوید طفیل) وغیرہ وغیرہ۔ جیسے مجموعے منظر عام پر آئے اور تاریخ رقم کر گئے۔

ترقی پسند تحریک نے تو اس صنف کو خوب خوب پروان چڑھایا اور نئے اسالیب و آہنگ اسے عطا کر کے تقویت بخشی۔مختصر یہ کہ مکتوب نگاری نے نثر کی ایک صنف کی حیثیت سے ادب میں جگہ پائی ہے۔البتہ اردو میں مکتوب نگاری کی قدامت ہنوز تحقیق طلب ہے۔اس کے بعد تو اردو میں مکتوب نگاری کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا جس کے راہروؤں میں سید سلیمان ندوی، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، نواب صدر یار جنگ، مہدی افادی، چودھری محمد علی ردولوی، مولوی عبد الحق، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، میراجی، احمد ندیم قاسمی، محمد طفیل، عبدالمجید سالک، خلیق احمد نظامی وغیرہ اسی طرح خواتین قلم کاروں اور ادیبوں نے بھی خطوط نگاری کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام ہیں مثلاً عطیہ فیضی، بیگم حسرت موہانی، ممتاز شیریں صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر، صفیہ اختر، امریتا شیر گل، پروین شاکر، شفیق فاطمہ شعریٰ، شفیقہ فرحت صغریٰ مہدی، وغیرہ کے نام نہایت فخر اور اعتبار سے لیے جا سکتے ہیں۔اردو مکتوب نگاری کے ارتقا اور اس روایت کے فروغ میں ان تمام مشاہیر ادب نے خون بن کر رگ سنگ میں اترنے کی جو کوشش وسعی کی ہے، وہ تاریخ اردو ادب میں آب زر سے لکھی گئی اور اس کا اعتراف رہتی دنیا تک کیا جاتا رہے گا۔خاص طور پر خواتین نے جو خطوط دست حنائی سے لکھے ہیں اور ان پر کاجل سے بھیگے اشکوں سے نشان لگائے ہیں۔وہ بھی ادب، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ، نفسیات، سیاست، سماج اور تمام افادی موضوعات و امکانات سے بھرپور ہیں۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مکاتیب غالب کے ان دو مجموعوں کے نام بتایئے جو بہت مشہور ہوئے؟

۲۔ مکاتیب حالی کو پہلی بار کس نے شائع کیا؟

۳۔ مکاتیب اقبال کے کتنے مجموعے شائع ہوئے؟

۴۔ غبار خاطر کے مکتوب الیہ کا نام بتایئے؟

۵۔ فراق کے خطوط کے مجموعے کا نام بتایئے؟

---

## 2.6 خلاصہ

---

مذکورہ بالا تمام گفتگو کو اجمالی طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں مکتوب نگاری نے اب ایک مضبوط اور مستحکم روایت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مرزا اسداللہ خان غالب سے لے کر عہد حاضر تک، اردو ادیبوں نے اپنے خطوط کے وسیلے سے مثبت شعور و آگہی کو پروان چڑھانے کی مقدور بھر سعی کی ہے۔ اردو نثر میں غالب کے خطوط کو جدت ادا اور جدت فکر کے سبب اوّلیت حاصل ہے۔ سرسید کے خطوط میں ملکی، سیاسی اور تہذیبی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ حالی کے خطوط سادگی اور شبلی کے خط ایجاز، نکتہ آفرینی اور طنزیہ جملہ بازی کے اعتبار سے اردو خطوط کے اسالیب میں دلکش اضافہ ہیں۔ لیکن اقبال کے خطوط، زیب النساء کے مطابق:

''اردو نثر کا نہایت شگفتہ نمونہ ہیں، یہ نہ بے رنگ ہیں اور نہ خشک۔''(۹)

ابوالکلام آزاد کی کتاب غبار خاطر علمی و ادبی خطوط کی مثال ہے، جس میں جدت اسلوب، جدت خیال، ظرافت، بذلہ سنجی سبھی کچھ موجود ہے۔ یہ اردو زبان کی ثروت مندی اور ترقی یافتہ ہونے کی دلیل ہے کہ اس کے سرمایۂ مکاتیب میں موضوع اور اسلوب کے سارے رنگ جمع ہو گئے ہیں۔ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

''جو خطوط مکاتیبی ادب کو فکر و فن دونوں کے اعتبار سے ایک قیمتی سرمایہ بناتے ہیں وہ ہیں، جن میں سوز دل اور غم جاناں کے ساتھ مسائل حیات اور غم روزگار سے بھرپور تعرض کیا گیا ہو۔''(۱۰)

سادگی و سلاست، خلوص و دردمندی اور انسانی ہمدردی خطوط کا امتیازی وصف قرار دیا جاتا ہے۔ مکتوب نگاری میں تکلف، تصنع، مافوق الفطرت عناصر، ریاکاری اور موقع پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ مراسلے کو مکالمہ بناتے وقت دل کی بات قلم کے وسیلے سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ حرف صداقت لکھنا اس تخلیقی عمل کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ خط کے مندرجات اور موضوعات کا تعلق براہ راست زندگی سے ہوتا ہے۔ جس

طرح زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی ممکن نہیں اسی طرح مکاتیب کی اثر آفرینی سے چشم پوشی احسان فراموشی کے مترادف ہے۔مکتوب نگار اپنی ذات کو پس منظر میں رکھتے ہوئے حالات کی اس مسحور کن انداز میں عکاسی کرتا ہے کہ قاری پر تمام حقائق خود بہ خود منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔خطوط کے ذریعے احساس،ادراک، وجدان اور عرفان کی جو متاع بے بہا نصیب ہوتی ہے کوئی اور صنف ادب اس کی برابری نہیں کرسکتی۔تخلیق کار،اس کے تخلیقی عمل اور اس کے پس پردہ کارفرما لاشعوری محرکات کی اساس پر جب تحلیل نفسی کا مرحلہ آتا ہے تو نقاد کو تخلیق کار کے مکاتیب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب بھی کسی تخلیق کار کی حیات وخدمات پر تحقیقی کام کا آغاز ہوتا ہے تو محقق اس کے مکاتیب کو اولین ماخذ کے طور پر اپنے تحقیقی کام کی اساس بناتا ہے۔

مکاتیب میں شگفتگی،شائستگی،صداقت،خلوص، دردمندی اور انسانی ہمدردی ان کے مؤثر ابلاغ کو یقینی بنانے والے عناصر ہیں۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقدار وروایات کے معیار بدلتے رہتے ہیں لیکن مکاتیب کی دلکشی اور دل پذیری کا معیار ہر دور میں مسلمہ رہا ہے۔محبتوں، چاہتوں،قربتوں اور عہد و پیماں کے امین خطوط کی اہمیت، ہر دور میں موجود رہے گی۔دور جدید میں برقی ذرائع ابلاغ نے حالات کی کایا پلٹ دی ہے۔ای میل، ایس۔ایم۔ایس، ٹیلی فون،وہاٹس ایپ، ایف بی میسنجر نے فاصلوں کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔اس کے باوجود خطوط نگاری اور ان کی ترسیل کا سلسلہ جاری ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک جذبوں کی صداقت کا بھرم قائم ہے۔آج اس ترقی یافتہ دور میں گرچہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے لوگوں سے رابطہ کرنے میں آسانی کردی ہے لیکن اس کے باوجود لوگوں کو خط و کتابت کی عادت نہیں چھوڑنی چاہیے۔

متذکرہ باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں مکاتیب نگاری کی صنف قدیم اور توانا ہے۔دور حاضر میں سائنسی ایجادات کے نتیجے میں ترسیل کے نئے نئے ذرائع وجود میں آچکے ہیں جس کی وجہ سے مکتوب نگاری میں کمی واقع ہوئی ہے مگر اس کی اہمیت اب بھی مسلم ہے۔

## 2.7 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ خط کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ غالب سے پہلے اردو میں مکتوب نگاری کا سرسری جائزہ لیجیے۔

۳۔ اقبال کی خطوط نگاری کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی لکھیے۔

۱۔ اردو میں مکتوب نگاری کے آغاز وارتقا کا سرسری جائزہ لیجیے۔

۲۔ غالب کے مجموعے ہائے مکاتیب کا تعارف کرواتے ہوئے ان کی مکتوب نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۳۔ کسی دو کی مکتوب نگاری کا جائزہ لیجیے۔

1۔ابوالکلام آزاد 2۔مولوی عبدالحق 3۔رشید احمد صدیقی

## 2.8 فرہنگ

| | | | |
|---|---|---|---|
| نجی | خانگی | قاصد | پیغام رساں |
| خبر رساں | خبر پہنچانے والا | ترسیل | پہنچانا |
| مکتوب نویس | خط لکھنے والا | مکتوب الیہ | جس کے نام خط لکھا گیا |
| مکتوب نگاری | خطوط نویسی | صدیق | دوست |
| ترسیل وابلاغ | بھیجنا، روانہ کرنا | متکلم | بات کرنے والا |
| ایجاز | اختصار | مرقوم | لکھا گیا |
| مقفی | جس میں قافیہ ہو | مسجّع | مقفی نثر |
| جزا | بدلہ | چشم نم | بھیگی آنکھ |
| روابط | تعلقات | دعا گو | دعا کرنے والا |

## 2.9 معاون کتابیں


ڈاکٹر خلیق انجم غالب کے خطوط (دو جلدیں)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی خطوط اقبال

ابوالکلام آزاد غبار خاطر

گوپی چند نارنگ بیسویں صدی میں اردو ادب

ڈاکٹر سید عبداللہ میرا من سے عبدالحق تک

ڈاکٹر شہناز انجم ادبی نثر کا ارتقا


munotes.in

## 2.10 حواشی

(۱) صالحہ عابد حسین: یادگار حالی، آئینہ ادب، لاہور، ص: ۱۳۰

(۲) صغریٰ مہدی، آواز دوست

(۳) صغریٰ مہدی، مقدمہ سخن دل نواز (مکاتیب غلام السیدین) مرتبہ: نئی دہلی، سیدین میموریل ٹرسٹ، ص: ۷

(۴) غالب کے خطوط، ج: اول، مرتبہ خلیق انجم، نئی دہلی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، ص: ۳۲۱

(۵) ڈاکٹر سید عبداللہ، اردو خط نگاری۔ نقوش مکاتیب نمبر۔ ادارہ اردو فروغ، لاہور

(۶) ترجمان القرآن، ص: ۲۴

(۷) زیب النساء: اقبال کی اردو نثر، ایک مطالعہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ص: ۵۲۷

(۸) وجہی سے عبدالحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص: ۹۶۲

(۹) اردو میں سوانح نگاری، گلڈ پبلیشنگ ہاؤس کراچی، ص: ۲۱

(۱۰) خلیق انجم، غالب کے خطوط، ج: اول (مرتب) نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوت، ص: ۳۰۱

(۱۱) خواجہ احمد فاروقی، مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا۔ اردو قومی کونسل، نئی دہلی، ص: ۱۷

☆☆☆☆☆

munotes.in

# اکائی: 3۔ غالب کی مکتوب نگاری

ساخت:


3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 غالب کا عہد

3.4 غالب کی حیات

3.5 غالب کی ادبی خدمات

3.6 غالب کی مکتوب نگار

3.7 غالب کے ایک خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ کا پس منظر اور تجزیہ

3.8 خلاصہ

3.9 نمونۂ امتحانی سوالات

3.10 فرہنگ

3.11 معاون کتابیں


## 3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد غالبؔ کی مکتوب نگاری پر روشنی ڈالنا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے عہد کو جاننے میں مدد کرنا ہے۔ غالب کی حیات اور ادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ طلبا ان کے خطوط کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

## 3.2 تمہید

غالب اردو زبان کے بڑے شعرا میں شامل ہیں۔ غزل کی تاریخ ان کے بغیر نامکمل کہلائے گی، غالب کے کارنامے نثر میں بھی لاجواب ہیں، پھر چاہے وہ انشا پردازی ہو یا ان کی خطوط نگاری، یہ بات بہت اہم ہے کہ غالب ہی سے جدید اردو نثر کا آغاز ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط اردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعے ایک طرف جہاں اپنے عہد کی تاریخ قلم بند کی ہے وہیں اردو نثر میں بے تکلفی اور وسعت بھی پیدا کی

munotes.in

ہے۔ان کے تحریر کی شوخی نے ان کے خطوط کو بے مثل بنا دیا ہے۔اس اکائی میں ہم غالب کی زندگی کے چند پہلووں، ان کے عہد اور ان کی خطوط نگاری کا جائزہ لیں گے۔

## 3.3 غالب کا عہد

مرزا اسداللہ خاں غالب اردو زبان کے عظیم شاعروں سے میں سے ایک ہیں۔ یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ غالب صرف ایک فرد نہ تھے بلکہ ایک ادارہ تھے انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گزارا اور دہلی محض ایک شہر نہ تھا بلکہ ایک تہذیب تھی۔ اٹھارہویں صدی کا زمانہ اور خاص طور سے دہلی جو ہندوستان کا مرکز تھا وہ زمانہ دھیرے دھیرے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ نئے نئے ادارے وجود میں آ رہے تھے۔ عدالتیں، انتظامیہ اور پولیس کے اصول وضوابط طے ہو رہے تھے اب انھیں جواب دہی کا سامنا تھا، فرد واحد کا فیصلہ حرف آخر نہیں تھا۔ ایک عدالت کے اوپر اس سے بڑی عدالت تھی، لوگوں کو اپیل کا حق مل رہا تھا اگرچہ یہ ادارے مثالی نہیں تھے ان پر شاہی اثرات موجود تھے اور انگریزوں کے نظام کے اثرات بھی تھے لیکن ادارے بہر حال وجود میں آ رہے تھے اور پھر صحافت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اخبارات، ایک خاص دائرے کے اندر ہی سہی، کافی کھل کر عوامی مسائل کا اظہار کر رہے تھے۔ عوام کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ حقائق جاننا بھی ان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بھی کہ وہ کچھ بنیادی حقوق بھی رکھتے ہیں محض فرائض ادا کرنے والے غلام نہیں۔ رائے عامہ وجود میں آ رہی تھی۔ قلعہ معلیٰ علم و دانش اور ادب و ثقافت کا مرکز بن گیا تھا۔ اکبر اعظم کے دور میں دربار کا جو سیکولر مزاج بنا تھا وہ لوٹ آیا تھا۔ ہندوستانی اور یورپی کلچرز کے امتزاج سے ایک نیا کلچر وجود میں آ رہا تھا۔ ہندوستانی کلچر اس قدر طاقتور تھا کہ اہل یورپ بھی اسے اپنانے پر مجبور ہو چکے تھے۔ زبان و ادب ایک جدید رنگ اختیار کر رہے تھے جو زیادہ شوخ، زیادہ گہرا اور تادیر باقی رہنے والا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اتنی زیادہ نابغۂ روزگار شخصیات دہلی میں جمع ہو گئی تھیں کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ غالب، ذوق، مومن، صہبائی، شیفتہ، آزردہ، سید احمد خان، حالی، نذیر احمد، ذکا اللہ، ضیا الدین، ماسٹر رام چندر، ڈاکٹر چمن لال پیارے لال آشوب، پنڈت من پھول وغیرہ۔ دہلی کالج اور دہلی سوسائٹی جیسے ادارے قائم ہو رہے تھے۔ ورنا کیولر سوسائٹی کا مطبع قائم ہو چکا تھا۔ جدید علوم کی کتب ترجمہ ہو کر چھپ رہی تھیں۔ ریاضی، جغرافیہ، طبیعیات و کیمیا اور فلکیات پر کتابیں تحریر کی جا رہی تھیں۔ سائنسی علوم میں دلچسپی اس قدر بڑھ رہی تھی کہ دہلی کالج کے طلبہ جو تجربے کالج کی تجربہ گاہ میں کرتے، وہ گھر جا کر دہراتے اور اعزہ و اقارب اور دوستوں کو حیران کر دیتے۔

بینک اور مالیاتی ادارے بن رہے تھے۔ لگان تاوان نہیں رہا تھا۔ کرائے کے فوجیوں اور لڑکوں کی بجائے ریونیو آفیسرز کی مانگ تھی۔ لوگوں کا تعلیم کی جانب میدان بڑھ رہا تھا۔ نوجوان طالع آزمائی کی بجائے علم حاصل کر کے تحصیل

دار مصنف اور استاد بن رہے تھے۔ مدتوں بعد لوگ ایک فوج دیکھ رہے تھے جس کے سپاہی شہر میں دکانداروں سے اشیاء ادائیگی کر کے خریدتے تھے اور دیہات میں لوگوں میں لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار نہیں کرتے تھے' کیونکہ انہیں باقاعدگی کے ساتھ معقول تنخواہ ملتی تھی۔ تجارتی شاہراہیں محفوظ ہونے کی وجہ سے تجارت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈاک کا نظام سستا اور قابل اعتبار تھا۔ ریل اور ٹیلی گراف آ رہے تھے۔ دریاوں سست رفتار کشتیوں کی جگہ دخانی جہازوں نے لے لی تھی۔ فاصلے سمٹ رہے تھے۔ دربار کے سیکولر مزاج کی وجہ سے عوام بھی مذہبی اور فرقہ وارانہ تصادم کا ایک بھی واقعہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا۔ پھر ۱۸۵۷ء آتا ہے اور امن دامان' تعلیم و معیشت سب بارود کی نذر ہو جاتے ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ لوٹ مار اس وسیع پیمانے پر ہونے لگتی ہے گویا نادر شاہ ابدالی' روہیلوں اور مرہٹوں کا دور لوٹ آیا ہو۔ ہندستانی کلچر میں تیزی سے ڈھلتے ہوئے یورپی اپنے قدم روک لیتے ہیں۔ اب وہ شستہ اردو اور فارسی کی بجائے ''ویل ٹم کیا مانگٹا'' قسم کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ جہاں ہندوستانیوں کی حالت سدھارنے اور مغل شہزادوں کو تعلیم سے آراستہ کر کے اعلیٰ عہدے دینے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے' وہاں ہندوستانیوں کو کچلنے اور شہزادوں کو توپ دم کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں شاہ جہان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نئی اور شاندار عمارتوں کی تعمیر اور تزئین و آرائش اور تعمیر نو کی جا رہی تھی' وہاں تاریخی عمارات کو منہدم کرنے کا وسیع پیمانے پر آغاز کیا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کو نچلے درجے کی مخلوق قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہندوستان ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا تھا۔۔۔ لیکن یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے اندر جذب کر لیتا تھا' ہندوستان کی تاریخ میں ہی پہلی بار ہوا تھا کہ حاکم قوم کے خلاف ایک وسیع عوامی بغاوت ابھری تھی' چنانچہ بداعتمادی کی ایک خلیج حکام اور عوام کے درمیان حائل ہو گئی۔ جنگ آزادی کے نتیجے کو دیکھتے ہوئے غالب کی 'رستخیز بے جا' کی اصطلاح بے معنی نہیں لگتی۔ ایک ایسے ہی قیامت خیز دور میں غالب نے اپنی زندگی کے ماہ و سال گزارے اور اسے تخلیقی سطح پر برتا۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ غالب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ کہاں گزارا؟

۲۔ اٹھارہویں صدی میں دہلی میں نابغہ روزگار شخصیات جمع ہو گئیں تھیں، چند شخصیات کے نام لکھیے۔

۳۔ اس زمانے میں کس سوسائٹی کا مطبع قائم ہو چکا تھا؟

۴۔ کن جدید علوم کی کتابیں اس زمانے میں شائع ہو رہی تھیں؟

## 3.4 غالب کی حیات

غالب کا اصل نام مرزا اسداللہ خاں تھا۔شاعری میں انھوں نے پہلے اسد تخلص اختیار کیا پھر اسے ترک کر کے غالبؔ ،ان کی عرفیت مرزا نوشہ تھی ،شاہی دربار سے انھیں نجم الدولہ ،دبیر الملک اور نظام جنگ جیسے خطابات سے نوازا گیا۔غالب دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے ۔غالب کے دادا شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے ۔غالب کے آباواجداد ترک تھے جس کا ذکر غالب نے بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے ۔غالب کی عمر ابھی پانچ برس کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا، والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا نصراللہ بیگ نے کی مگر افسوس ابھی غالب آٹھ برس کے ہوئے ہی تھے کہ چچا کا بھی انتقال ہوگیا، چچا کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ننھیال میں بڑے ناز ونعم سے ہونے لگی ، تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہوگئی چوں کہ الٰہی بخش دہلی میں رہتے تھے اس لیے غالب کا دہلی آنا جانا لگا رہا۔سولہ سترہ سال کی عمر سے دہلی میں مستقل طور پر رہنے لگے اور اسی مناسبت سے دہلوی کہلائے ۔

غالب فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے اور اس درجہ اپنی فارسی دانی پر اعتبار کرتے تھے کہ اپنے سوا کسی کو فارسی دا ں تسلیم ہی نہیں کرتے تھے سوائے امیر خسرو کے ۔فیضیؔ جو فارسی زبان کے مانے ہوئے شاعر اور زبان داں تھے ان کی فارسی دانی کے بارے میں غالب کہتے تھے کہ ’’کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے ۔‘‘ □ غالب کو پنشن ملا کرتی تھی جس میں اضافے کے لیے انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا۔کلکتے میں قیام کے دوران بعض افراد نے غالب کے فارسی کلام پر اعتراض کیا اور سند کے طور پر قتیل کا قول نقل کیا،قتیل فارسی کے بڑے عالم تھے مگر غالب نے جواب دیا کہ میں ’’دیوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا۔‘‘ چوں کہ قتیل نومسلم تھے اور ذات کے اعتبار سے کھتری تھے ،غالب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فارسی زبان کی سند اہل ایران سے دی جانی چاہیے لہذا غالب نے اپنی تائید میں فارسی کے اہلِ زبان کے اقوال پیش کیے ،جس پر اور اعتراض ہونے لگے ۔کلکتے میں غالب کے ماننے والے بھی بہت تھے ۔انھوں نے بھی جواب دیا اور اس طرح جواب در جواب کا سلسلہ قایم ہوا کلکتے کے قیام کے دوران غالب نے ایک مثنوی ’’بادِ مخالف‘‘ کے نام سے لکھی ،جس میں انھوں نے اپنی غریب الوطنی کا ذکر ،اہل کلکتہ کی نامہربانی کا شکوہ ،اور ان کے اعتراضات اور اپنے جوابات نہایت صفائی اور عمدگی سے بیان کیے ہیں ۔

کلکتہ جاتے ہوئے غالب کا لکھنؤ میں بھی قیام رہا۔وہ والئی اودھ نصیرالدین حیدر سے بھی ملنا چاہتے تھے اس لیے انہیں پہلے نائب السلطنت روشن الدولہ سے ملنا ضروری تھا۔غالب نے ان سے ملنے کے لیے دو شرطیں رکھیں کہ روشن الدولہ انہیں تعظیم دیں اور وہ کوئی نذر پیش نہیں کریں گے ۔روشن الدولہ نے یہ شرطیں نہیں مانیں ۔کلکتے سے واپسی میں

انہوں نے کسی اور ذریعے سے نصیرالدین حیدر کو قصیدہ بھیجا۔ انہوں نے پانچ ہزار روپے دینے کا حکم دیا۔ روشن الدولہ نے تین ہزار روپے خود ہڑپ لیے اور دو ہزار میں سے کہا جتنے چاہو اس میں سے غالب کو دے دینا۔ بہرحال اس بات سے غالب کی خودداری ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اور واقعے سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کہ غالب حد درجہ خوددار تھے۔ دلّی کالج میں فارسی کے استاد کی جگہ خالی تھی۔ غالب کو جب اس عہدے پر تقرر کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے قبول کر لی۔ کالج کے باب الداخلہ پر پہنچ کر اپنے آنے کی اطلاع پرنسپل کو کی۔ جب انگریز پرنسپل ان کی پیشوائی کے لیے نہیں آیا تو کچھ دیر انتظار کر کے لوٹ گئے۔ دوبارہ کسی جگہ پرنسپل سے ملاقات ہوئی تو اس نے دریافت کیا کہ انہوں نے کالج کی ملازمت کیوں قبول نہیں کی۔ غالب نے جواب دیا کہ حسب معمول میرے مطلع کرنے کے بعد بھی جب آپ نہیں آئے تو میں لوٹ گیا۔ پرنسپل نے کہا کہ چونکہ آپ کالج کے استاد کی حیثیت سے آئے تھے اس لیے میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں آپ کے استقبال کے لیے آتا۔ غالب نے جواب دیا کہ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ کالج کی استادی سے ہماری حیثیت میں اضافہ ہوگا لیکن اس کی بجائے رہی سہی حیثیت بھی جاتی رہے تو اس کو ہمارا سلام۔

غالب کی صحت آخری زمانے میں بہت خراب رہنے لگی تھی۔ انتقال سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا بند ہو گیا تھا اکثر ان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی اس حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب دیا کرتے تھے اور جب خط لکھنا مشکل ہو گیا تو دوسروں سے لکھوایا کرتے تھے۔ حالی لکھتے ہیں کہ انتقال سے ایک دن پہلے جب وہ عیادت کے لیے گئے تو علاء الدین احمد خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے جس میں ایک فقرہ یہ تھا کہ ''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں ہم سایوں سے پوچھنا۔'' بالکل ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء ہے۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مرزا غالب کا اصل نام کیا تھا؟

۲۔ شاعری میں پہلے غالب کون سا تخلص استعمال کرتے تھے؟

۳۔ غالب کی عرفیت کیا تھی؟

۴۔ غالب کے چچا کا کیا نام تھا؟

## 3.5 مرزا غالب کی ادبی خدمات

غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں دہلی میں جو ہنگامہ برپا ہوا اس کے سبب غالب گھر پر ہی رہا کرتے تھے کہیں آنا جانا حتیٰ کہ خطوط بھی بند ہو گئے۔ غالب کو مطالعے کا بڑا شوق تھا لیکن وہ کرایے پر لے کر کتابیں پڑھا کرتے تھے اس لیے ان کے گھر میں کتابیں نہ تھیں۔ اتفاق سے ان کے گھر میں ایک فارسی لغت ''برہان قاطع'' موجود تھی یہ لغت مولوی محمد حسین برہانی تبریزی کی لکھی ہوئی تھی اور فارسی کی بہت مستند لغت سمجھی جاتی تھی وقت گزاری کے لیے غالب اسے دیکھنے لگے تو اس میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں۔ انھوں نے ''برہان قاطع'' کی ایک ایک غلطی کے بارے میں لکھنا شروع کیا اور اس طرح اس لغت کی رد میں ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام انھوں نے ''قاطع برہان'' رکھا، برہان قاطع کے معنی ہیں قطعی دلیل یا ثبوت جب کہ قاطع برہان کے معنی ہیں دلیل یا ثبوت کو قطع کرنے والا۔ اس کتاب کی اشاعت پر بھی ایک ادبی اور علمی ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ غالب پر بہت سے اعتراضات ہوئے جس کا جواب خود غالب نے اور ان کے ماننے والوں نے دیا یہ سلسلہ کافی عرصے تک چلتا رہا لیکن غالب ایسی باتوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔

غالب کو زندگی میں اعزازات بھی ملے۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے، ان کے استاد پہلے ذوق ہوا کرتے تھے، ذوق کے انتقال کے بعد غالب بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر اپنا کلام انھیں دکھایا کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے خاندان تیمور کی تاریخ لکھنے پر غالب کو مامور کیا۔ غالب نے اس کا نام ''پرتو ستاں'' رکھا۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کیا، پہلے حصے کا نام ''مہر نیم روز'' رکھا اور دوسرے حصے کا نام ''ماہِ نیم ماہ'' رکھا۔ ان کو اس خدمت کے معاوضے میں پچاس روپے ماہانہ ملا کرتے تھے۔ لیکن وہ اس تاریخ کا پہلا ہی حصہ لکھ پائے تھے کہ غدر ہو گیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

غالب کی تصانیف میں ''دیوان غالب'' شامل ہے۔ غالب نے صرف اپنا منتخب کلام شایع کیا ان کا پورا کلام نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شایع ہوا۔ غالب کی زندگی ہی میں ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عود ہندی'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ان کے انتقال سے صرف چار مہینے پہلے شایع ہوا۔ غالب خطوط کا دوسرا مجموعہ ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے شایع کرنا چاہتے تھے لیکن یہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ غالب کے خطوط کا مکمل مجموعہ ڈاکٹر خلیق انجم نے چار جلدوں میں ''غالب کے خطوط'' کے نام سے شائع کیا۔ قاطع برہان کے مخالفوں کے جواب میں غالب نے ''لطائفِ غیبی'' ''تیغِ تیز'' اور ''نامۂ غالب'' کے عنوان سے کتابیں شایع کیں۔

ان کی فارسی تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ دیوانِ غالب (فارسی) ۲۔ دستنبو ۳۔ پنج آہنگ ۴۔ سبد چیں ۵۔ مہر نیم روز

غالب کا فارسی دیوان بہت ضخیم ہے اور دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ کلکتے میں قیام کے دوران غالب نے کس نام سے ایک مثنوی لکھی؟

۲۔ غالب نے قاطع برہان کیوں لکھی؟

## 3.6 غالب کی مکتوب نگاری

اردو نثر کی تاریخ پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو دکھائی دیتا ہے کہ نثر کے بیشتر نمونے قافیے اور مرصع کاری سے سجے سجائے ہیں اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی رہی کہ اس وقت علمی اور ادبی کارناموں کے لیے فارسی زبان ہی استعمال ہوا کرتی تھی اردو کے بڑے بڑے شعرا و ادبا نے فارسی ہی کو اپنا ذریعۂ بنایا میر، مصحفی، قائم چاند پوری، میر حسن نے اردو شعرا کے تذکرے بھی فارسی زبان ہی میں لکھے، یہاں تک کہ میر نے اپنی آپ بیتی 'ذکرِ میر' فارسی ہی میں لکھی ہے خود غالب بھی پہلے فارسی ہی میں خط لکھا کرتے تھے۔ اردو نثر میں غالب سے پہلے جو علمی اور ادبی کتابیں ملتی ہیں ان میں دو طرح کا انداز ملتا ہے ایک سادہ اور سلیس، دوسرے رنگین اور قافیے سے پر اسلوب، سادہ اور سلیس نمونے فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں ملتے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کالج کا مقصد ہی انگریزوں کو زبان سے اور یہاں کی تہذیب سے واقف کرانا تھا۔ دوسرے کچھ مذہبی نثر کے نمونے تھے جن کا مقصد یہ ہوتا تھا اور ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک مذہب پہنچے اور آسانی سے سمجھ میں آجائے لیکن جہاں تک ادبی رجحان کا سوال ہے تو وہ مقفیٰ اور مسجع نثر ہی کی طرف تھا۔

غالب کے خطوط کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم انداز کی عبارت آرائی کو ترک کر دیا اور اظہارِ مدعا پر زور دیا۔ عبارت آرائی میں اصل بات کہیں رہ جاتی ہے اور صرف نثر کو چمکانا سجانا ہی اصل مقصد بن جاتا ہے ،غالب نے اس طرز سے انحراف کیا انھوں نے صرف قدیم انداز کے طرز تحریر کو ختم کیا بلکہ خطوط میں بھی پرانے انداز کو جس میں طویل طویل القاب و آداب ہوتے تھے اسے بھی ترک کیا، ان کے بعض خطوط تو بغیر القاب و آداب کے ہیں ،یعنی براہِ راست عرضِ مدعا۔ بیشتر خطوط میں انتہائی مختصر القاب و آداب ہیں۔ مثلاً علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''یار بھتیجے، گویا بھائی، مولانا علائی'' اسی طرح انھیں کے نام ایک خط میں لکھا۔'' جانا عالی شانا''

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں وہ بنا کسی القاب و آداب کے یوں لکھتے ہیں۔

'' کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے

خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں۔''

یہی وجہ ہے کہ حالیؔ کہتے ہیں۔

''مرزا کی اردو خط و کتابت کا انداز سب سے نرالا ہے۔''

لیکن اس معاملے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ غالب اپنے مخاطب کو حیثیت کے مطابق پکارتے تھے۔ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ غالب کسی کی سماجی حیثیت سے مرعوب ہوتے تھے تو ان کو''پر تصنع اور طویل القاب'' لکھ دیا کرتے تھے ۔غالبؔ نے نواب میر غلام بابا خاں کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔''ستودۂ بہر زبان و نامور بہر دریا'' یا ایک جگہ اور انھیں یوں مخاطب کیا ہے۔''نواب صاحب ،شفیق کرم گستر،مرتضوی تبار،نواب میر غلام بابا خاں بہادر'' لیکن ایسے القاب سینکڑوں خطوط میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

غالب کے خطوط کی دوسری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا اور اس کا احساس انھیں بھی تھا کہ انھوں نے خطوط نگاری کو بات چیت کا ذریعہ بنا دیا ہے۔اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب ! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔''

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

''بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔''

مراسلے کو مکالمہ بنا دینا خاص غالب کی ایجاد تھی۔حالی نے یہ بات بالکل درست لکھی ہے کہ''نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ بعد میں کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہو سکی۔'' غالب نے اپنے بہت سے خطوط میں یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔مثلاً منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کیوں صاحب،اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی، نہ مرزا صاحب ہی آئے اور نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔''

اسی طرح میر مہدی حسین مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

میری جان! تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانہ،صبر و تسلیم و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔''

غالب کے خطوط کی ایک اور خوبی ان کی شوخی و ظرافت ہے۔غالب کے مزاج شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اسی لیے مولانا الطاف حسین حالی نے انھیں حیوانِ ظریف کہا ہے۔زندگی کے آخری ایام غربت اور بیماری میں

گزرے مگران کی خوش مزاجی میں ذرا بھی فرق نہ آیا، غالب کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ملاقاتی ان سے مل کوخوش ہو یہی عالم ان کے خطوط میں بھی ہے، ان کی ظرافت کے نمونے جابہ جا خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں مثال کے طور پر کسی نے شکایتاً کہا کہ غالب روزہ نہیں رکھتے اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں۔

''روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رکھتا ہوں، کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی روٹی کا کوئی ٹکڑا کھالیا، یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات۔''

اسی طرح غالب جس مکان میں رہا کرتے تھے اس کی چھت ٹپکتی تھی، ظاہر ہے ایسی صورت میں کتنی تکلیف سے گزرنا ہوتا ہوگا لیکن ایسی حالت میں بھی وہ شوخی وظرافت سے کام لیتے ہوئے اپنے گھر کے بارے میں ایک خط میں یوں لکھتے ہیں۔

''دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں، چھت چھلنی ہوگئی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔''

خطوط کی اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ خط لکھنے والے کی زندگی سے متعلق معتبر مواد اسی صنف کے ذریعے سے ملتا ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے واقعات کو ترتیب وار تو نہیں بیان کیا ہے لیکن زندگی کے تمام حالات ضرور بیان کردیے ہیں ابتدائی زندگی سے لے کر اپنی اخیر زندگی تک، یعنی ایک طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے خطوط میں ہمیں ان کی پوری آپ بیتی ملتی ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے غالب کے خطوط کو سنہ کی ترتیب کے ساتھ جمع کرکے ''غالب کی آپ بیتی'' مرتب کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے خطوط میں اپنے زمانے کی تاریخ بھی قلم بند کردی ہے خاص طور پر غدر سے پہلے اور غدر کے بعد دہلی کی حالت کی جو تفصیل انھوں نے لکھی ہے وہ ان کے خطوط کے سوا شاذ ہی کہیں ملتی ہے۔ اس زمانے کی دہلی کی کیفیت غالب کے ایک خط میں یوں ملتی ہے۔

''واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔''

غالب کے خطوط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت دہلی پر کیا قیامت ٹوٹی تھی اور غالب نے کیسے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اپنے ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

''وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ

مرزا یوسف آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے، مرے ہووں کا نام نہیں لیتا بچھڑے ہووں میں سے کچھ گنے ہیں، اللہ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔''

خطوط غالب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ناول کے بہت ہی اہم اجزا ملتے ہیں۔ ان کے خطوط میں مکتوب الیہ کرداروں کی طرح سامنے آتے ہیں۔ ناول کی طرح ان میں بھی مکالمے ملتے ہیں، ناول کے حقیقی پس منظر کی طرح غالب کے خطوط میں انیسویں صدی کا ہندوستان اور خاص طور پر دہلی اور غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات ملتے ہیں۔ ناول کی بہت ساری شرطوں کو غالب کے خطوط پورا کرتے ہیں، غالب کے خطوط کی انھیں خصوصیات کی طرف حالی نے بھی اشارہ کیا ہے اور مشہور فکشن نگار انتظار حسین نے اسی بنیاد پر غالب کو اردو کا پہلا فکشن نگار قرار دیا ہے۔

یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ غالب کے خطوط نے جہاں ایک طرف جدید اردو نثر کی داغ بیل ڈالی وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے ناول بعد میں انھیں بنیادوں پر قائم ہوا۔ غالب کے خطوط بھی ان کی شاعری کی طرح ہمیشہ باقی رہیں گے کہ ان پر وقت کا اثر کبھی نہ ہوگا۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ میر نے اپنی آپ بیتی کس زبان میں لکھی؟

۲۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کی نثر سادہ اور سلیس کیوں تھی؟

۳۔ غالب نے اپنے خطوط میں قدیم انداز کی عبارت آرائی کو کیوں ترک کیا؟

۴۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک خط میں کیا لکھا ہے؟

۵۔ حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف کیوں کہا ہے؟

## 3.7 غالب کے ایک خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ کا پس منظر اور تجزیہ

خط کا تجزیہ کرنے سے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ منشی ہرگوپال تفتہ کون تھے اور غالب سے ان کا کیا تعلق تھا؟ منشی ہرگوپال تفتہ بھٹناگر کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد کا نام موتی لال تھا۔ تاریخ ولادت کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ ۱۸۰۰ء۔ ۱۷۹۹ء سال ولادت تسلیم کیا گیا ہے۔ سکندر آباد کے رہنے والے تھے اور یہیں ۳؍ستمبر ۱۸۷۹ء کو وفات پائی۔ تعلیم گھر پر ہی ہوئی اس زمانے میں فارسی تعلیم کا رواج تھا۔ ہرگوپال تفتہ نے

فارسی شعرا کے دواوین کا مطالعہ کم عمری ہی میں شروع کر دیا تھا۔شاعری سے انھیں خاص رغبت تھی اور خود بھی بہت اچھے شاعر تھے، غالب نے ان کی شاعرانہ ہنرمندی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

تفتہ، مرزا غالب کے اہم اور چہیتے شاگردوں میں سے ایک ہیں، ان کا شمار غالب کے مخصوص احباب میں ہوتا ہے۔غالب کے سب سے زیادہ خطوط انھیں کے نام ملتے ہیں ان خطوط کی تعداد تقریباً ۱۲۳ ہے جو غالب کے ہوش و حواس کے آخری وقت تک کے ہیں اور کم از کم بیس سال کی مدت پر محیط ہیں جس میں استاد اور شاگرد کے گہرے مراسم ،اصلاح شعر، غالب کے عزیز دوستوں کا تفتہ سے محبت کرنا ،تفتہ کے کلام کی بے حد تعریف، روٹھے دوست کو منانے کے سوسو جتن اور ہر خط میں ان کو فرزند دل بند، کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ، نور چشم، بندہ پرور جیسے مخلصانہ اور مشفقانہ القابات شامل ہیں۔غالب تفتہ سے کس قدر محبت رکھتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غالب ہر ہر واقعے، ہر پل، ہر گئی گزری، ہر ضرورت ہر مصیبت اور راحت سے تفتہ کو باخبر رکھتے ہیں۔

زیر مطالعہ خط (نمبر ۱) میں بھی غالب نے کس محبت اور اپنائیت سے تفتہ کو یاد کیا ہے اس کا اندازہ مطالعے کی پہلی قرأت ہی سے ہو جاتا ہے۔اس خط میں غالب کو کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ جیسے مشفقانہ لقب سے مخاطب کیا ہے یعنی غالب نے تفتہ کو دل کے کاشانے کا چودھویں کا چاند کہا ہے۔اس لقب سے جہاں ایک طرف محبت اور اپنائیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں غالب کے جمالیاتی ذوق کا بھی پتا چلتا ہے۔تفتہ غالب کو اپنا کلام بہ غرض اصلاح لکھ بھیجتے تھے اور غالب اس کی اصلاح کر کے انھیں بہ ذریعہ ڈاک روانہ کرتے تھے ،تفتہ نے اپنے خط میں اپنا کلام بھیجنے کی درخواست کی اور لکھا کہ کہیں آپ اسے پڑھ کر یاد دیکھ کر گھبرا نہ جائیں، تفتہ کے اسی خط کے جواب میں غالب نے مذکورہ خط لکھا اور تفتہ کے اندیشے کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔غالب لکھتے ہیں کہ زین العابدین مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے بچے جو میرے پوتے ہیں اور دم بہ دم مجھے ستاتے ہیں لیکن میں برداشت کرتا ہوں انھیں اف تک نہیں کہتا یہاں تک کہ وہ مجھے کھانا کھانے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاوں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی گرا دیتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں لیکن خدا گواہ ہے میں ان کی حرکتوں سے تنگ نہیں آتا نہ گھبراتا ہوں، چوں کہ تم میرے بیٹے کی طرح ہو سو تمھارا کلام میرے پوتے کی طرح ہوئے ،لطف کی بات یہ ہے کہ تمھارا کلام خوب صورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی، ظاہر ہے کہ میں ان سے کیوں کر گھبراؤں گا آپ انھیں ڈاک کے ذریعے بھیج دیجیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی اصلاح کر کے انھیں ڈاک کی مدد سے بھیج دوں گا، غالب نے اس خط میں تفتہ کے کلام کی بے انتہا تعریف و توصیف کی ہے نیز ان کو قبول عام کی دعا بھی دی ہے کہ تمھارے کلام کو شہرت دوام حاصل ہو۔

جیسا کہ ہم سبھی اس بات کو جانتے ہیں کہ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے یعنی ان کے خطوط کو پڑھ کر ایسا

لگتا ہے جیسے دو افراد آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔اس خط میں بھی ایسی ہی صورت حال ہے۔طرز تخاطب دیکھیے:

''سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔''

سنو صاحب کا ٹکڑا ایک مکالماتی فضا کو خلق کر رہا ہے اس کے بعد کی جو تفصیل غالب نے اپنے پوتوں سے متعلق کی ہے اسے پڑھ کر غالب کی جزئیات نگاری کا اندازہ ہوتا ہے یعنی غالب چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو بھی کتنی خوب صورتی کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، پوتوں کی حرکتوں کا بیان کافی دل چسپ ہے شاید اسی سبب انتظار حسین غالب کو اردو کا پہلا فکشن نگار کہتے ہیں، دوسری بات غالب کا طرز استدلال ہے یعنی وہ اپنی بات کو دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، تفتہ کے اس اندیشے کو رفع کرنے کے لیے کہ کہیں آپ میرا کلام دیکھ کر گھبرا نہ جائیں کس طرح غالب نے دو مختلف صورت حال کو یکجا کر دیا ہے یعنی اپنے پوتوں اور تفتہ کے کلام کو معنوی پوتا کہہ کر دو چیزوں کو مند منطقی طور پر ایک کر دیا ہے اور اندیشوں کو زائل کر دیا ہے۔ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ خط غالب کا ایک اہم خط ہے۔

## 3.8 خلاصہ

غالب اردو زبان کے بڑے شعرا میں شامل ہیں لیکن غالب کے خطوط بھی اردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس وقت کی دہلی میں گزارا جو محض ایک شہر نہ تھا بلکہ ایک تہذیب تھی۔ غالب فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے اور اس درجہ اپنی فارسی دانی پر اعتبار کرتے تھے کہ اپنے سوا کسی کو فارسی داں تسلیم ہی نہیں کرتے تھے سوائے امیر خسرو کے۔غالب کو پنشن ملا کرتی تھی جس میں اضافے کے لیے انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے میں دہلی میں کے ہنگامے کے سبب غالب گھر پر ہی رہا کرتے تھے کہیں آنا جانا حتیٰ کہ خطوط بھی بند ہو گئے۔انھوں نے ایک فارسی لغت ''برہان قاطع'' کی غلطیوں پر ایک کتاب لکھ ڈالی، جس کا نام انھوں نے ''قاطع برہان'' رکھا۔غالب کی زندگی ہی میں ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عود ہندی'' کے نام سے شائع ہوا لیکن خطوط کا دوسرا مجموعہ ''اردوئے معلیٰ'' ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔غالب کے خطوط کا مکمل مجموعہ ڈاکٹر خلیق انجم نے چار جلدوں میں ''غالب کے خطوط'' کے نام سے شائع کیا۔پروفیسر نثار احمد فاروقی نے غالب کے خطوط کو سنہ کی ترتیب کے ساتھ جمع کر کے ''غالب کی آپ بیتی'' مرتب کی ہے۔غالب کی صحت آخری زمانے میں بہت خراب رہنے لگی تھی۔ان کی وفات ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو ہوئی۔

## 3.9 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ غالب نے دلی کالج کی ملازمت کیوں ٹھکرادی؟

۲۔ کلکتے میں قتیل اور غالب کی معرکہ آرائی کو اپنے الفاظ میں قلم بند کیجیے۔

۳۔ ''غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔'' اس بیان کی وضاحت کیجیے۔

(ب) تفصیلی جواب لکھیے۔

۱۔ غالب کے عہد کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ غالب کی مکتوب نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

۳۔ غالب کی ادبی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

(ج) سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی وضاحت کیجیے۔

۱۔ ''کتاب کا حسن کانوں سے سنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کررہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب ملے گا۔''

۲۔ ''تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانہ۔ صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو۔''

## 3.10 فرہنگ

| | |
|---|---|
| بلاتردد | بلاجھجک |
| نابغۂ روزگار شخصیات | اپنے زمانے کے غیر معمولی افراد |
| طالع آزمائی | قسمت آزمائی |
| دخانی جہاز | بھاپ سے چلنے والے پانی کے جہاز |
| رستخیز | قیامت، ہنگامہ |
| پیشوائی | استقبال، رہنمائی |
| مرصع کاری | جڑاو، اصطلاح میں مرصع نثر سے مراد ایسی نثر ہے جس میں لفظوں کی ترتیب اور ساخت کو بنا، سجا کر لکھا جاتا ہے۔ |

مسجع نثر　　سجی سجائی نثر، اصطلاح میں ایسی نثر کو کہتے ہیں جس میں دو فقروں، جملوں کے تمام الفاظ بالترتیب وزن میں ہوں

فقدان　　موجود نہ ہونا، گم کر دینا، کھو دینا

## 3.11 معاون کتابیں:


۱۔ مرزا غالب کا داستانی مزاج از شکیل الرحمان

۲۔ غالب کی تہذیبی شخصیت از جیلانی کامران

۳۔ مرزا غالب از اسلم فرخی

۴۔ تاریخ ادب اردو از پروفیسر نورالحسن نقوی


☆☆☆

munotes.in

# اکائی: 4 ۔ سرسید احمد خان کی مکتوب نگاری

ساخت :

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 سرسید کا عہد
4.4 سرسید کی حیات اور شخصیت
4.5 سرسید کی ادبی خدمات
4.6 سرسید کی مکتوب نگاری
4.7 خلاصہ
4.8 نمونہ امتحانی سوالات
4.9 فرہنگ
4.10 معاون کتابیں

## 4.1 اغراض ومقاصد

طلبا کے لیے اس اکائی کا مطالعہ سرسید احمد خان کی زندگی کو سمجھنے مدد دے گا۔ سرسید احمد خان کیوں تعلیمی اور ادبی دنیا میں آج بھی ایک رہنما کی حیثیت سے نمایاں نام ہے؟ سرسید احمد خان کی صحافت اور ان کی مکتوب نگاری اردو ادب اور صحافت میں کیا مقام رکھتی ہیں؟ سرسید کی زندگی میں وہ کیا واقعات وقع پذیر ہوئے تھے جن کے زیر اثر انھوں نے اپنے لیے ذاتی منافع کی بجائے قومی استفادے کو اہمیت دی؟ ایسے مزید کئی سوالات اس اکائی کے مطالعے کے بعد جوابات پا جائیں گے۔ کوشش یہ ہوگی کہ طلبا اس اکائی کو پڑھنے کے بعد سرسید کے تعلق سے مکمل معلومات حاصل کرلیں گے۔

## 4.2 تمہید

سرسید احمد خان نہ صرف تعلیمی سلسلہ میں قوم کے رہنما تھے بلکہ ادبی، سیاسی، سماجی، صحافتی جیسے مختلف شعبہ ہائے حیات میں بھی ان کی رہنمائی قوم کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ یہ اکائی سرسید کی زندگی کو روشنی میں لانے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی اور ذاتی نثر نگاری کے منتخب مثالوں سے بھی مزین ہے۔ ذاتی نثر نگاری سے میری مراد ان کی مکتوب

munotes.in

نگاری ہے۔سرسید نے ایسے وقت جب قوم پستی کی کھائی میں گر رہی تھی، بلکہ تقریباً گر چکی تھی تعلیم جیسے ہتھیار سے اسے نئی زندگی دینے کی کوشش کی۔سرسید کی تعلیمی کوششوں کے ثمر کے طور پر علی گڑھ میں موجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنی آن بان شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔یہ اکائی سرسید کی شخصیت کو آسان انداز میں آپ کے سامنے پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔

## 4.3 سرسید کا عہد

سرسید جس دور میں پیدا ہوئے وہ دور مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ایک حکومت کے ختم ہونے اور دوسری کے عروج حاصل کرنے کا دور تھا۔سرسید کی ولادت کے تقریباً چالیس سال بعد عرصے سے دہلی سلطنت کی تاجداری کا شرف حاصل کیے ہوئے مغل بساط حکومت کو لپیٹ گئے تھے اور ان کی جگہ سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریز سریر آرائے سلطنت ہو گئے تھے۔یہ تبدیلی صرف حکومت کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ ایک تہذیب، ایک ثقافت، ایک عہد، ایک دنیا کے بدل جانے کی صورت حال تھی۔سرسید کا بچپن اور اوران کی جوانی مغلیہ حکومت کے سسکتے ہوئے لمحوں میں گزرا ہے۔انھوں نے اس سلطنت کے اختتام کی آہٹ سن لی تھی۔انگریزوں کی بڑھتی سرگرمیاں عام ہندوستانی کی طرح انھیں بھی پریشان کر دیتیں،مگر وہ مستقبل کا منظر نامہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزوں کی عملداری ہی ہندوستان کی قسمت ہے۔ وہ منصف تھے۔ان کے سامنے کئی معاملے آتے تھے۔وہ سماج کی نبض بھی جانتے تھے۔خاص کر مسلمانوں کی تفرقہ بازی سے وہ اکثر نالاں رہتے تھے۔علما کی اپنے فرقے کی برتری کی غیر صحیح دلیلوں کو سماج میں پنپنے والے تعصب کی وجہ سمجھتے تھے۔دوسری طرف ہم مذہبوں کی عصری تعلیم سے منافرت بھی ان کے سامنے ایک وجہ تشویش تھی۔انگریزی عمل داری ایک حقیقت کے روپ میں جلوہ گر ہو رہی تھی اور قوم مسلم خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور اس حقیقت سے منہ موڑ رہی تھی۔

سرسید احمد خان انگریزوں کے مکمل دسترس حاصل کرنے سے قبل تاریخی ماخذات کو محفوظ رکھنے کی اپنی کوششوں میں لگاتار مصروف رہے ہیں۔جام جم، آثارالصنادید وغیرہ تصانیف سرسید کے بیدار تاریخی شعور کی گواہی دیتی ہیں۔۱۸۵۷ء کے بعد یعنی پہلی جنگ آزادی یا غدر کے بعد انگریز ہندوستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے چکے تھے۔اور انھوں نے اپنے سب سے خطرناک دشمن کی حیثیت سے مسلمانوں کو منتخب کیا ہوا تھا اور اسی کے مطابق سزائیں بھی دی جارہی تھیں۔ایسے پرآشوب دور میں کہ جب انگریزوں کے سامنے مسلم ہونا ہی گناہ تصور کیا جاتا تھا سرسید احمد خان نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقیقت بیان کی اور بغاوت کے لیے انگریزوں کی کئی غیر ذمہ دارانہ سرگرمیوں کو موردالزام ٹھہرایا تھا۔''اسباب بغاوت ہند'' کتاب سرسید کی مجاہدانہ کاوش تھی۔یہ کتاب انھوں نے انگریز سرکار میں

پیش کی اور بغاوت کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے لیے انگریزوں کو آمادہ کیا۔ دوسری طرف اپنی قوم کو انگریز دشمنی سے باز آنے کی تاکید بھی کرتے رہے۔ انگریزوں سے راہ ورسم رکھنا یا ان کے ساتھ کھانا کھانا جیسی کئی باتیں تھیں جنھیں قوم اپنے لیے حرام تصور کیے ہوئے تھی، سرسید نے ایسی کئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی عملاً کوششیں کیں۔ انھوں نے سمجھا کہ قوم کو اس پستی سے نکالنے کے لیے تعلیم کے ہتھیار کا استعمال سب سے کارگر ہوگا، انھوں نے قوم کو سمجھایا کہ انگریزوں کی جانب سے بدظن ہونے اور انھیں اپنا حریف سمجھنے کی بجائے ان کی تعلیم حاصل کی جائے اور ان سے مقابلہ کیا جائے اسی وقت قوم کی ترقی ممکن ہے۔ انگریزوں کے مظالم کی شکار قوم کو سرخرو بانے کے لیے سرسید نے تن من دھن کی بازی لگائی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے ابھرنے اور اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لیے سرسید نے قوم کے لیے جس قدر کوششیں کیں ان میں ایک نمایاں کوشش کا نام ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' ہے۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ سرسید کے دور میں کون سی حکومت ختم ہوئی؟

۲۔ انگریزوں کی سلطنت کے بننے کے وقت سرسید عمر کی کس منزل میں تھے؟

۳۔ پہلی جنگ آزادی کب ہوئی؟

۴۔ کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کے مصنف کون ہیں؟

۵۔ انگریزوں سے راہ ورسم رکھنا یا ان کے ساتھ کھانا کھانا مسلمانوں کے نزدیک کیسا تھا؟

۶۔ قوم کو پستی سے نکالنے کے لیے سرسید نے کس ہتھیار کو کارگر بتایا تھا؟

## 4.4 سرسید کی حیات اور شخصیت

سید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید محمد متقی تھا۔ ان کی والدہ کا نام عزیز النسا بیگم تھا۔ سرسید کے والد آزاد منش انسان تھے، نیک تھے مگر طبیعت آزاد پائی تھی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے بھی وہ بے فکر رہتے تھے۔ لیکن سرسید کی والدہ نے بچوں کی تربیت ایک خاص نہج پر کی۔ سرسید لکھتے ہیں۔۔۔

> ''جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو خبر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انھوں نے نے نہایت ناراض ہوکر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو، جہاں اس کا جی چاہے چلا

جائے، یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی۔ انھوں نے کہا ''دیکھو جی آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں، میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا، ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔'' میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تا کہ قصور معاف کرائیں۔ انھوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکور کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔'' (حیات جاوید ص ۴۱)

سرسید کی والدہ کے کئی قصے ہیں اور ہر قصے میں والدہ کی زندگی کے روشن پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ ایسی والدہ کے آغوش میں پلے بڑھے سرسید میں قوم کا درد و تعلیم کی فکر در آئی تھی اور قوم کی ڈوبتی ناؤ کنارے لگ گئی تھی۔ سرسید کی والدہ کا ایک اور قصہ پیش ہے۔۔۔

''زبین ایک لاوارث بڑھیا تھی۔ میری والدہ اس کی خبر گیری کرتی تھی۔ جب میں دلّی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زبین ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک ہی سی تھی۔ حکیم نے والدہ کے لیے کسی قدر افاقہ کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا تجویز کیا۔ مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اس معجون کو تیار کرا کے والدہ کے پاس لے گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ انھوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زبین کو بھی مفید ہوگی لیکن اس کو کون بنوا کے دے گا۔ انھوں نے خود اس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زبین کو کھلاتی رہیں۔ زبین کو اس سے بہت فائدہ ہوا، مگر میری والدہ بھی بغیر اس معجون کے استعمال کے اچھی ہو گئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا؟ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زبین ہی نے کھائی مگر خدا نے دونوں کر صحت عنایت کی۔'' (حیات جاوید ص ۴۳)

سرسید کے والد محمد متقی مغلیہ دربار میں اپنے اجداد کے کارناموں کی وجہ سے رسائی رکھتے تھے اور وظیفہ بھی پاتے تھے۔ ان کے انتقال تک دربار سے خلعت اور تنخواہ برابر جاری رہی۔ سرسید اپنے بچپن میں خود بھی والد صاحب کے ساتھ

دربار میں جاتے رہے ہیں۔ سید محمد متقی کی تین اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا سید محمد خان، بیٹی صفیۃ النسا بیگم اور چھوٹا بیٹا سید احمد خان۔ سید احمد خان کی شادی پاکیزہ بیگم عرف مبارک بیگم سے ۱۸۳۸ء میں ہوئی۔ ان کے یہاں تین بچے ہوئے دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ یکے بعد دیگرے والد اور بڑے بھائی کے انتقال سے سرسید پر گھر کا بار بڑھ گیا تھا۔ وہ عدالت میں منصف کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کی تعلیم کے سلسلے میں جو روایتیں ہیں ان کے مطابق سرسید نے قرآن شریف، گلستان، بوستان، شرح ملا، شرح تہذیب، ریاضی، ہندسہ اور طب کی تعلیم مختلف عالموں سے حاصل کی۔ اور پھر امتحان کے بعد قانون کے شعبہ میں داخل ہو گئے۔ جہاں وہ ترقی کرتے رہے۔ اسی دوران انھیں بہادر شاہ ظفر کے دربار سے جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ سرسید مختلف مقامات پر ملازمت کرتے رہے ہیں جن میں آگرہ، مین پوری، فتح پور سیکری، دہلی، بجنور، مرادآباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس شامل ہیں۔ سرسید جب بجنور میں تھے اس وقت میرٹھ کی فوجی چھاونی سے بغاوت کی آواز بلند ہوئی اور وہ پہلی جنگ آزادی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء کی بات ہے۔ انگریزوں نے اس بغاوت کو بری طرح کچل دیا تھا۔ اور اس بغاوت کا سارا الزام مسلمانوں پر تھوپ دیا تھا، دہلی کی سڑکوں پر مسلم نمائندوں کو سرعام پھانسیاں دی گئیں۔ شکوک وشبہات میں کئی معصوم مسلمانوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑیں۔ جب بغاوت ختم ہوگئی تو انگریزی حکومت نے اس کی وجوہات جاننے کے لیے ایک کمیشن بنایا تو سرسید اس کا ایک حصہ بنا دیے گئے۔ بغاوت کے دوران سرسید نے انگریز سرکار کی حمایت کی تھی اور باغیوں کی لوٹ پاٹ، رہزنی اور قتل وغارت گری کی شدید مخالفت کی تھی۔ انھوں نے کئی انگریزوں کی جانیں بھی بچائی تھیں۔ اس کے صلے میں انگریز حکومت نے سرسید کو انعامات دینے کا اعلان کیا لیکن سرسید نے قبول نہیں کیا۔ اور قوم کی پست حالی کو سدھارنے کے کام میں اپنے آپ کو جھونک دیا۔

بغاوت کے بعد سرسید کی زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ نہ صرف انگریزوں کو مسلم قوم کی بدظنی سے بچانے میں اپنی خدمات پیش کر رہے تھے، بلکہ قوم مسلم کو انگریزوں کے عتاب سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ تحقیقی لفظ نصاریٰ، لائل محمڈنز آف انڈیا، تبین الکلام، رسالہ طعام اہل کتاب جیسی متعدد تصانیف سرسید کی خدمات عالیہ میں شمار ہوں گی۔ سائنٹفک سوسائٹی، مدرسۃ العلوم، سائنٹفک گزٹ، تہذیب الاخلاق، حال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی روشن مثالیں سرسید کی کامیاب جدوجہد کی دلیلیں ہیں۔ خطبات احمدیہ سرسید کی وہ مایہ ناز کتاب ہے جس میں انھوں نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منطقی انداز میں نمایاں کیا ہے اور یہ کتاب انگریز مصنف ولیم میور کی ''دی لائف آف محمدؐ'' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ سرسید نے قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر کا فریضہ بھی ادا کیا۔ گویا سرسید کی زندگی نہ صرف دنیاوی سطح پر قوم کے لیے باعث برکت تھی بلکہ عاقبت کے لحاظ سے بھی خیر تھی۔

سرسید احمد خان انگلستان گئے تھے۔ وہاں انھوں نے نہ صرف انگریزوں کی ترقی دیکھی بلکہ ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا تھا۔مگر جس وقت سرسید ولایت جانے کا ارادہ کررہے تھے اس وقت ان کی جیب کافی تنگ تھی۔ البتہ ان کے بیٹے سید محمود کو انگریزی حکومت کی اسکالرشپ پر انگلستان جانے کی اجازت مل گئی تھی۔سرسید کے جانشین مولوی سید مہدی علی محسن الملک لکھتے ہیں۔۔۔

''جب سید احمد خان لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کرسکتا۔انھوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔انھوں نے بارہا مجھ سے اس بارے میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہوسکتا جب تک میں بذات خود اصول وطرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کرسکوں۔''(حیات جاوید ص ۱۴۸)

سرسید ولایت گئے اور وہاں نہ صرف انھوں نے طرز تعلیم کا جائزہ لیا بلکہ ''خطبات احمدیہ'' جیسی نایاب اور نادر کتاب بھی تصنیف کی۔جس کو پڑھنے کے بعد ولیم میور نے اپنی غلطی مان لی تھی اور سرسید کے اندراجات کو قبول کیا تھا۔ایک سال پانچ مہینے انگلستان میں رہ کر سرسید وطن واپس آ گئے۔اور یہاں انھوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا نیز ایک کمیٹی برائے تعلیم جس کا نام ''کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کی۔علی گڑھ میں زمین کی حصولیابی کے بعد کالج بنانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔سرسید نے خود چندہ وصول کرنے کا ارادہ کیا۔اور اپنی منصفی، بیٹے سید محمود کی معروف وکالت جیسے مراتب کو درکنار کرکے انھوں نے لاہور، امرتسر، دلی، حیدرآباد، بھوپال وغیرہ شہروں میں جاکر چندہ کی وصولی کی اور کالج کی عمارتیں بنوائیں۔کالج شروع ہوا۔طلبا کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔سرسید اپنے خواب کو پورا ہوتے دیکھ رہے تھے۔

۲۶ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔کالج کے کرکٹ گراؤنڈ میں نمازہ جنازہ ادا کی گئی اور مسجد کے صحن میں تدفین عمل میں آئی۔سرسید کے والدہ، ان کی اہلیہ بغاوت کے بعد چند برسوں میں انتقال کر گئیں تھیں۔سرسید کی وفات سے چار سال قبل یعنی ۱۸۹۴ء میں ان کے بڑے بیٹے سید حامد بھی خدا کو پیارے ہوگئے تھے اور ان سے دو سال قبل ۱۸۹۲ء میں سرسید کی بہن صفیۃ النسا بیگم بھی مالک حقیقی سے جاملی تھی۔آخر عمر میں سرسید اپنے چھوٹے بیٹے سید محمود سے نالاں رہتے تھے۔وجہ ان کی کثرت شراب نوشی تھی۔انھیں سید محمود کی صحت کی فکر رہتی تھی۔تاہم پہ در پہ ان نفسیاتی حملوں نے سرسید کی صحت کو بھی متزلزل کردیا تھا۔اور بالآخر وہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

سرسید کی شخصیت کے متنوع روپ ہیں۔الطاف حسین حالی نے ان کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے

''رنگ سرخ وسفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھویں جدا جدا، آنکھیں روشن، نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، ناک نسبتاً چہرے کی شان کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹی، کان لمبے، گلے میں دائیں جانب رسولی جو ہمیشہ داڑھی میں چھپی رہتی تھی، چہرہ کی ہیئت مجموعی باوجود پر رعب ہونے کے دلکش، جسم بہت فربہ، قد لمبا مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ نما، ہڈی چکلی، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست اور متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من۔۔۔۔۔۔۔ بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے۔'' (حیات جاوید ص ۶۹۳)

سرسید مہمان نواز تھے، ان کی طبیعت میں ظرافت کا عنصر غالب تھا۔ ان کے خطوط میں بھی اس کے کئی اشارے موجود ہیں ۔ اور ان کی روز مرہ زندگی میں بھی اس کے تجربے بارہا واقع ہوئے ہیں۔ منطقی گفتگو کو پسند کرتے تھے۔ اختلافات سے ڈرتے نہیں تھے، تاہم ان کے مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ کسی اجنبی سے پہلی ملاقات میں بے تکلف ہونا انھیں پسند نہیں تھا۔ وہ مردم شناس تھے۔ کس شخص سے کیا کام قوم کی فلاح و بہبودی کا لینا ہے وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ شبلی نعمانی کالج میں عربی کی تدریس کے لیے امیدوار کی حیثیت سے علی گڑھ آئے تھے، سرسید نے ان میں مطالعے سے دلچسپی کو محسوس کیا تو انھیں منتخب کرلیا۔ سرسید خود بھی مطالعہ کے خوگر تھے۔ محسن الملک ایک پرخلوص اور دیانت دار رفیق کار کی حیثیت سے سرسید کے ساتھ نباہ کیے۔ سرسید ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ سرسید کے انگلستان کے اخراجات کے لیے جو کوششیں محسن الملک نے یہاں ملک میں رہ کر کیں ان سے سرسید کو کافی سہولیات میسر آئیں اور سرسید ان کی ان کوششوں کی بہت تحسین کرتے تھے۔ سرسید کسی کام کی ٹھان لیتے تھے تو اسے تکمیل تک پہنچانے کی حتی الامکام کوشش کرتے تھے۔ کالج بناتے ہوئے انھیں مختلف مسالک کے علما کے اعتراضات کا سامنا تھا، انھوں نے ہر مکتبہ فکر کو اطمینان دلایا کہ کسی کا مسلک یہاں خطرے میں رہے گا۔ یہاں صرف تعلیم سے بحث ہوگی۔ سرسید نے تعلیمی ادارے کو قایم کرکے قوم کو ایک عظیم سرمائے سے سرفراز کیا ہے۔

## اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ سرسید احمد خان کب پیدا ہوئے؟

۲۔ سرسید کے والد کا نام کیا تھا؟

۳۔ سرسید کی والدہ کا نام کیا تھا؟

۴۔ کس انگریز افسر نے ''دی لائف آف محمدؐ'' کتاب لکھی؟

۵۔ کتاب ''دی لائف آف محمدؐ'' کا جواب سرسید نے کون سی کتاب لکھ کر دیا؟

۶۔ سرسید کی تاریخ وفات کیا ہے؟

## 4.6 سرسید کی ادبی خدمات

سرسید احمد خان نے نہ کوئی افسانہ لکھا، نہ ناول، نہ نظم، نہ غزل اور نہ کوئی ڈراما۔۔۔! اس کے باوجود اردو کے عناصر خمسہ میں سرسید کو شامل کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سرسید نے زبان و ادب میں آسان طرز تحریر کی وکالت کی تھی اور خود بھی اس کے اعلیٰ نمونے پیش کیے تھے۔ ''تہذیب الاخلاق'' رسالے میں لکھے ہوئے ان کے متعدد مضامین آسان زبان اور عام فہم انداز میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ادبی چاشنی بھی محسوس کی جاسکتی ہے اور اصلاحی نقطہ نظر بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ سرسید نے اپنے رفقا کی آسان زبان میں مفید ادب تخلیق کرنے کی جانب رہنمائی کی۔ وہ ڈپٹی نذر احمد کے اصلاحی ناولوں سے خوش ہوتے تھے، الطاف حسین حالی کی آسان نظموں سے متاثر ہوتے تھے، محمد حسین آزاد کی تحریروں سے لطف لیتے تھے، شبلی نعمانی کی عالمانہ اردو سے محظوظ ہوتے تھے۔ اردو ادب سرسید سے قبل مقفیٰ مسجع عبارتوں سے بھرپور ہوتا تھا۔ لکھنوی دبستان کی طرز نگارش نے اردو میں رنگین عبارت آرائی کو کافی ترقی دی تھی۔ الطاف حسین حالی نے اس طرز نگارش کی شاعری کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا اور سرسید کی آسان طرز نگارش کی حمایت کی تھی۔

''آثار الصنادید'' میں عمارات اور کھنڈرات کے علاوہ دلی کی نمائندہ ہستیوں کے تعلق سے سرسید کی نگارشات اہمیت کی حامل ہیں۔ مرزا اسداللہ خان غالب، امام بخش صہبائی، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، نظام الدین ممنون، شاہ نصیر، شیخ ابراہیم ذوق جیسے نامور شعرا کے حالات اور ان کی شاعری کے نمونے درج کے ہیں۔ ان شعرا پر مضامین بعنوان ''ذکر بلبل نوایانِ سوادِ جنت آباد حضرت شاہجہاں آباد'' شامل کیے ہیں۔ مرزا غالب کی فارسی شاعری اور اس کے نمونے کتاب میں درج ہیں۔ دوسرے شعرا کے اردو اور فارسی دونوں مثالیں داخل کتاب ہیں۔

سرسید نے اپنے بھائی سید محمد خان کے اخبار ''سیدالاخبار'' میں شروعاتی مضامین لکھے تھے۔ یہ اخبار بند ہوگیا تو سرسید نے چند سال تاریخی اور مذہبی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد سرسید کے تحریر کا رخ بدل گیا تھا۔ انھوں نے تقابلی ادبیات، سائنس اور تعلیم جیسے موضوعات پر کافی لکھا۔ ایسے ادارے قائم کیے جہاں تراجم کے ذریعے عصری اور سائنسی موضوعات پر انگریزی میں لکھی گئی کتابیں مہیا کرائی جاتی تھیں۔ ان کو اردو کا جامہ پہنایا جاتا تھا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' رسالہ جاری کیا جس میں تسلسل کے ساتھ انھوں نے نہ

صرف تعلیم، سائنس اور نئی ایجادات پر لکھا بلکہ اردو زبان وادب پر بھی انھوں نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔سرسید رنگین عبارت آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔انھوں نے آسان زبان میں ادب کی تخلیق کی حمایت کی۔ان کے مضامین خود اس سلسلہ میں مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ان کے مضامین کے تعلق سے کئی قسم کی آرا بیان کی گئیں ہیں۔کچھ مضامین میں افسانہ کی آہٹ محسوس کی گئی ہے تو کسی مضمون میں انشائیے کے عناصر کے ہونے کی بات کہی گئی ہے۔بعضوں نے انگریزی صنف اسّے کے نمونے سرسید کی تحریر میں تلاش کیے ہیں۔افسانہ تو اپنی معنوی اور فنی ساخت میں انفرادی پہچان رکھتا ہے اور سرسید کے مضامین اس سے سروکار نہیں رکھتے تاہم اسّے یا انشائیہ کی کافی ساری خوبیاں سرسید کے مضامین میں مل جاتی ہیں۔اسے نگاری کے بنیاد گزار مان ٹین نے اسے کی تعریف میں لکھا تھا کہ ایسی نثر جس میں غیر مربوط خیالات ہلکے فلسفیانہ رنگ میں بے ساختگی کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ان میں درس اخلاق بھی ملتا ہو۔اس تعریف میں کئی اور باتیں بھی شامل ہوتی رہی ہیں جیسے اسلوب کی تازہ کاری، رمز وکنایہ، روشن ضمیری، قلب ونظر کی گہرائی، دانش وبینش کی باریکی، تجزیاتی حس وغیرہ۔۔۔۔۔۔

''انتخاب مضامین سرسید'' کل بیس (۲۰) مختلف الموضوع مضامین کا مجموعہ ہے۔سرسید جس معاشرے کو سنوارنا چاہتے تھے وہ ابھی نفسیاتی کشمکش کا شکار تھا۔یہاں اصلاح کی گنجائشیں بہت تھیں مگر ماحول تناؤ سے بھرا ہوا تھا۔ایسے میں اصلاح کے لیے اٹھایا جانے والا سخت قدم کامیابی کے راستے معدوم کر دیتا۔یہ وقت دانش وبینش کی باریکی کے مظاہرے کا تھا جس کے لیے نہ صرف قلب ونظر کی گہرائی درکار تھی بلکہ دل پاکیزگی وروشن ضمیری کی ضرورت بھی تھی۔قدرت نے سرسید میں یہ صفات اتم درجہ پر ودیعت کی تھیں۔لہٰذا انھوں نے حکمت ودلیل کے ساتھ اپنی باتیں لوگوں کے سامنے رکھیں۔سرسید کے مضامین اخلاقی درس اور پند ونصیحت کی خوبیوں سے متصف ہیں۔ان کی تحریر میں تصنع کی کارفرمائی نہیں ہے۔ان کا اخلاص ہر مقام پر محسوس ہوتا ہے۔وہ بے ساختگی کے ساتھ اپنے خیالات اور احساسات کو رقم کرتے چلے گئے ہیں۔چند نمونے اخلاقی درس وپند نصیحت کے ملاحظہ ہوں۔

''انسان کے لیے لازم ہے کہ محبت کے سوا کسی دوسری چیز کے دل میں لانے کا خیال نہ کرے اور ایسی ہی زندگی انسان کے لیے عمدہ زندگی ہے۔''(عزت)

''جس میں ہمدردی نہیں اس کی انسانیت میں نقصان ہے۔'' (ہمدردی)

''پس اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کرنے کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر

ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کرلو۔'' (بحث وتکرار)

کون کہہ سکتا ہے کہ سرسید کی تحریر کے یہ نمونے انشائیے کی تعریف میں نہیں آتے ؟ سرسید کے مضامین کے تعلق سے یہ کہہ کر صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے بعض مضامین صرف ترجمہ یا ترجمانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے انگریزی زبان سے اخذ واضافہ کیا ہے اور اس کا برملا اظہار واقرار بھی کیا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ اس وجہ سے ان کی تحریروں میں یا مضامین میں نثر کی دیگر اسالیب کی تحقیق درست نہیں ہوگی، ناانصافی پر مبنی پیمانہ ہوگا۔''

(ورق در ورق ص ۲۲۱، ۲۲۲ اور ۲۲۵)

محسوس طور پر سرسید نے مستقبل کے اردو ادب کے لیے اصناف کی ایجاد کیں۔ ان سب کے علاوہ سرسید نے اردو نثر میں جس تبدیلی کی حمایت کی اور انھوں نے عملی طور پر اس کے نمونے پیش کیے اس سے اردو نثر نے ادب کی شاہراہ پر نئی سواریوں کے لیے آسانیاں فراہم کیں۔ سرسید کی علی گڑھ کے زیر اثر اردو زبان وادب کی اصلاح بھی ایک اہم مقصد تھا جس کے لیے سرسید اور ان کے رفقانے عملی مثالیں سامنے رکھیں۔ سرسید کی تمام کتابیں اور تمام تحریریں اردو زبان وادب کی ترقی میں معاون ہیں۔

## اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ انتخاب مضامین سرسید میں کتنے مضامین ہیں؟

۲۔ سرسید کے بھائی کے اخبار کا نام کیا تھا؟

۳۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کس نے جاری کیا تھا؟

۴۔ سرسید کی کس کتاب میں دہلی کی عمارات کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہے؟

۵۔ کس عنوان کے تحت سرسید نے اپنے کتاب میں دہلی کے شعرا کا ذکر کیا ہے؟

## 4.7 سرسید کی مکتوب نگاری

سرسید احمد خان کی زندگی کو الطاف حسین حالی نے ''حیات جاوید'' میں مکمل جلد بند کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ تاہم ان کے خطوط کی روشنی میں ان کی زندگی کے جو دوسرے گوشے نمودار ہوتے ہیں

وہ بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔سرسید کے خطوط کے دو مجموعے ''خطوط سرسید'' مرتب سر راس مسعود اور ''مکتوبات سرسید'' مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی موجود ہیں۔سر راس مسعود نے اپنی مرتبہ کتاب میں دوسو سے زائد خطوط درج کیے ہیں۔اور شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ۱۴۱ اشخاص کے نام لکھے گئے سرسید کے خطوط جمع کیے ہیں۔

جس طرح سرسید کے مزاج میں بے باکانہ پن تھا، بے ریائی تھی، سچائی، مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ، رواداری تھی ان کے خطوط میں بھی انہیں اوصاف کی جھلک نمایاں ہے۔سرسید کے خطوط کی کئی جہتیں ہیں۔سرسید نے ولیم میور کی کتاب کے جواب لکھنے کے لیے محسن الملک کو کافی پریشان کیا۔اس وقت سرسید لندن میں تھے اور ہندوستان میں ان کے خلیفہ کی حیثیت سے محسن الملک موجود تھے۔سرسید کی ضروریات کی ساری سہولتیں محسن الملک مہیا کروا دیتے تھے۔ان کے نام لکھے سرسید کے خطوط نہ صرف ان دونوں کے تعلقات کی مخلصانہ بنیاد کی شہادت دیتے ہیں بلکہ سرسید کی فکر اسلام اور قومی ہمدردی کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔

> ''سرسید نری جذباتیت کے قائل نہیں تھے اور نہ ہی اپنے مذہب یا عقیدے کے خلاف کسی قسم کی گستاخی یا کذب بیانی پر چراغ پا ہوجاتے تھے۔وہ منطقی ذہن کے مالک تھے۔ولیم میور کی کتاب ''دی لائف آف محمدؐ'' نے پیغمبرِ اسلام کی زندگی کو نہ صرف منفی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ تعصب، کذب بیانی اور ناانصافی کی تمام حدود پار کرتے ہوئے نہایت گستاخی کردی تھی۔آج کے دور میں ایسا معاملہ منظر عام پر آجانے پر جو ردعمل ہوتا ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔مگر ولیم میور کی کتاب کے ردعمل میں سرسید نے جو تدبیر اور حکمت اپنائی وہ زیادہ مہذب اور منطقی ہے۔''

(ورق در ورق ص ۱۲۲)

سرسید اسلام یا پیغمبر اسلام کی گستاخی پر چراغ پا نہیں ہوتے تھے مگر پریشان ضرور ہوجاتے تھے۔ولیم میور کی تصنیف کے تعلق سے ان کی پریشانی درج ذیل خط سے واضح ہوجاتی ہے

> ''ان دنوں میں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرت کے حال میں لکھی ہے۔اس کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔اور مصمم ارادہ کیا کہ آں حضرت کے سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جاوے۔اگر تمام روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو بلا سے۔''۸؎

(خط نمبر ۸، خط بنام نواب محسن الملک، مشمولہ خطوطِ سرسید، مرتب: سر راس مسعود نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۴ء ص ۴۹)

سرسید نے ''خطبات احمدیہ'' کتاب لکھ کر اس کا منطقی جواب دیا جس کے مطالعے کے بعد ولیم میور نے سرسید کے دلائل کو درست مان کر اپنی غلطی قبول کی۔ جذباتیت سے مغلوب ہو کر کوئی غیر اخلاقی یا غیر مہذب حرکت کسی بھی گستاخی کا موثر جواب نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے نیت میں خلوص اور مطالعہ میں وسعت درکار ہوتی ہے۔ نیز باتوں کو ثابت کرنے کا ہنر بھی لازمی ہوتا ہے۔

> ''اخلاقی برتری کے لیے (نیت میں) خلوص اور (زبان پر) سچائی جیسی قدریں نہایت ضروری ہیں۔ ہمارا معاشرہ ان دو خوبصورت اخلاقی اقدار کے معاملے میں بھی پسپا ہوا جا رہا ہے۔ قومی یا ملی مفادات کے مقابلے میں ذاتی اور نجی مفادات کے لیے کوششیں اولیت حاصل کر گئیں ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو انفرادی ضروریات اور لوازمات میں الجھا دیا ہے۔ ہم یہ دیکھنا ہی نہیں چاہتے کہ کنویں کے باہر کی دنیا کیا ہے؟ ہم معاشرے کے لیے کس طرح سودمند ثابت ہو سکتے ہیں؟ یا معاشرے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ ان باتوں کا اگرچہ فہم آ بھی جاتا ہے اور ہم قومی بھلائی کے کام میں شریک ہو بھی جاتے ہیں تو چونکہ مذکورہ بالا اخلاقی اوصاف سے کوسوں دور ہیں یعنی نہ نیت میں خلوص ہے اور نہ زبان پر سچائی ہے، جاہ و منصب کی حرص ہم پر غالب آ جاتی ہے اور ہمارے بظاہر اصلاحی کام بھی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا دل ایک بات کہتا ہے اور ہماری زبان پر دوسری بات ہوتی ہے۔ ہزار ہا مخالفتوں کے باوجود سرسید کی کامیابی اور جاویدانی کا اعلیٰ سبب ان کی نیت میں خلوص اور زبان کی سچائی تھی۔''

(ورق در ورق ص ۱۲۳۔ ۱۲۴)

اپنے ایک خط میں مدیر ''سرمور گزٹ'' منشی سراج الدین کو سرسید لکھتے ہیں

> ''میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو تمہارا دل اس کو سچ جانتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کام کیا۔'' (خط نمبر ۳، مشمولہ مکتوبات سرسید، مرتب: محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۴۷۸)

منشی سراج الدین صاحب سے سرسید ایک دوسرے خط میں سچائی کے تعلق سے کہتے ہیں

''اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجوں پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جس کے معنی یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو سچا جانیں اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے متعلق ہے۔''

(خط نمبر ۴، مشمولہ مکتوبات سرسید، مرتب: محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۴۷۹)

''سرسید کی حیات جہد مسلسل کی تابناک مثال ہے۔ اس تابناکی کی چمک کو ان کے صبر و تحمل نے مزید آب دار بنا دیا تھا۔ سرسید کو تعلیمی اور قومی فلاح کے کاموں میں شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، ناروا سلوک برداشت کرنا پڑا ہے، ان پر زمین تنگ کرنے کی کوششیں کی گئیں، انھیں مغلظات سے نوازا گیا۔ مگر انھوں نے ان ساری رسوائیوں کا ہمت اور صبر و استقلال سے مقابلہ کیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ نیکی کے کام میں جب قدم اٹھایا ہے تو اس میں رکاوٹیں آنی ہی ہیں۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔ کسی مخالف خط کا جواب یا کسی مخالف مضمون پر ردعمل کا طریق سرسید نے اختیار نہیں کیا ۔کبھی کسی خیر خواہ نے مخالفین کو جواب دیا بھی تو سرسید نے ایسا کرنے سے روکا ہے۔''

(ورق در ورق ص ۱۲۵)

برائی اور بے جا مخالفت کے متعلق سرسید درج ذیل خط میں جس طرح کی ترکیب بیان کرتے ہیں، عملی زندگی میں وہ انہیں اصولوں پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔۔۔۔

''ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں ۔۔ برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام ہے۔ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیے۔ بدوں یا بدطینتوں پر افسوس کرنا چاہیے مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔۔۔ جو لوگ برا کہنے والے ہیں ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیے۔ اگر وہ برائی ہم میں ہے تو اس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ برائی ہم میں نہیں ہے۔ برا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کون ہیں؟۔۔۔۔۔۔۔ خدا کی دنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے، ہر ایک اپنا کام کرتا ہے، تم اپنا کام کرو، مگر جان لو کہ تمہارا کام کیا ہے، نیکی، بھلائی اور اپنے کام سے مطلب دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں۔''

(خط نمبر ۱۱، خط بنام منشی سراج الدین، مشمولہ مکتوبات سرسید، مرتب: محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۸۶_۸۷)

الطاف حسین حالی نے ایک مثنوی ''مدوجزر اسلام'' لکھی تھی اسے ''مسدس حالی'' بھی کہتے ہیں اس مثنوی کو کافی پسند کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں اسلام کے عروج وزوال کی داستان بیان کی گئی ہے اور انداز تحریر بڑا دلکش اپنایا گیا ہے۔ سرسید نے تو اس مثنوی کو اپنے لیے توشہ آخرت تصور کر لیا تھا وہ اپنے خط میں الطاف حسین حالی کو لکھتے ہیں۔۔۔

> ''جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہو لی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہو لی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔۔۔حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے ۔۔۔۔۔۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں ۔ اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔''

(خط نمبر ۲، خط بنام حالی (۱۰ جون ۱۸۷۹ء) مشمولہ خطوطِ سرسید، مرتب: سر راس مسعود نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۴ء ص ۶۳_۶۴)

## اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ ''مکتوبات سرسید'' کے مرتب کون ہیں؟

۲۔ ''خطوط سرسید'' کے مرتب کا نام لکھیے۔

۳۔ سر ولیم میور کی کس کتاب کا جواب سرسید نے کتاب لکھ کر دیا؟

۴۔ سرسید کی کس کتاب میں ولیم میور کی کتاب کا جواب موجود ہے؟

۵۔ مثنوی ''مدوجزر اسلام'' کس نے تصنیف کی؟

۶۔ سرسید کے کسی ایک مکتوب الیہ کا نام لکھیے۔

## 4.8 خلاصہ

سرسید احمد خان اپنے دور کے ایک عہد ساز شخص تھے۔انھوں نے اپنی زندگی میں دو عالیشان حکومتیں دیکھیں۔ ایک کا زوال دیکھا دوسرے کا عروج دیکھا۔ایک کو اپنی تاریخ میں محفوظ کیا اور دوسری کے عروج وترقی سے فائدہ اٹھانے کی نہ صرف خود کوشش کی بلکہ قوم کو اس جانب راغب کیا۔قوم نہ تو اپنی تاریخ سے سبق سیکھنے کے لیے تیار تھی اور نہ ہی نئی روشنی سے مستفید ہونے پر راضی۔اپنے دور میں سرسید نے قومی اصلاح کا جو اہم کام کیا ہے اور جس کے لیے سرسید کو ہر طرح سے معتوب کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔اور نہ صرف بغاوت سے قبل بلکہ بغاوت کے بعد بھی سرسید نے ایک قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔بغاوت سے قبل سرسید کا تاریخی شعور بلندی پر نظر آتا ہے اور ان کے قلم سے ''آثار الصنادید'' جیسی حوالہ جاتی کتاب وجود میں آتی ہے۔اس کے بعد بھی وہ مسلسل اس جانب توجہ دیتے ہیں۔مگر بغاوت اور اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کی دگرگوں حالت نے انھیں پریشان کیا اور انھوں نے تاریخ کے ساتھ ساتھ جدید علم سے وابستگی کو لازمی سمجھ لیا اور قوم کو اس کے حصول کے لیے آمادہ کرنے کی جدوجید شروع کی۔جو تادم آخر وہ کرتے رہے۔

سرسید کی عملی تحریکات،سرسید کی تحریرات،سرسید کے مکتوبات نے انگریزوں کو، عام ہندوستانیوں کو اور خصوصی طور پر مسلمانوں کو کافی متاثر کیا ہے۔سرسید بیدار مغز اور دوراندیش انسان تھے۔انھوں نے ایک طرف تو انگریزوں کو اپنی خامیوں سے روشناس کرایا تو دوسری طرف اپنے ہم مذہبوں کو بھی آئینہ دکھانا ضروری سمجھا۔ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کی ہستی اختتام کی منزل میں تھی، وہ اپنا آپ ہی تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔حکومت کے ختم ہوجانے کے بعد نفسیاتی طور پر تو انھیں نقصان ہوا ہی تھا انگریزوں کے قہر نے مالی، جسمانی اور مذہبی طور پر بھی شدید چوٹ پہنچائی۔تلملائی ہوئی قوم اس قدر خوف وہراس اور بوکھلاہٹ کا شکار ہوئی کہ اس نے انگریزوں سے نفرت کو عین ایمان سمجھ لیا۔انگریزوں سے بات کرنا، ان کی وضع قطع اپنانا، ان کی تعلیم حاصل کرنا، ان کی زبان سیکھنا، ان سے تعلق رکھنا، ان کے ساتھ کھانا کھانا، ان کی تعریف کرنا وغیرہ تمام انسلاکات کی مخالفت کو جزو ایمان مان لیا گیا۔مذہب کی ایسی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی کہ جس کی تعلیم سے قوم ترقی نہیں کرے گی بلکہ مزید تنزل کا شکار ہوگی۔جہالت اور پسماندگی کے ذریعے

دین سمجھنے کی تعبیریں منظر عام پر آنے لگیں۔غدر کے بعد انگریزوں کی انتقامی کاروائیوں نے مسلمانوں کو اس قدر متنفر کر دیا تھا کہ وہ ان کی اچھی باتوں کی طرف بھی توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔علمی اور سائنسی ترقی کو بدعت قرار دے کر رفتار حیات سے دور بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔سرسید اس سارے منظر کو دیکھ رہے تھے۔غدر کے وقت ان کی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے انھیں جاگیر عطا کرنی چاہی جس کے لینے سے انھوں نے انکار کیا۔اور ملک سے ہجرت کا مصمم ارادہ کرلیا۔وہ مصر میں مستقل قیام کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ اب یہاں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔لٹی پٹی قوم نہ خود آگے بڑھ رہی ہے اور نہ حکومت کی جانب سے ایسی کوئی کوشش نظر آ رہی ہے کہ اس قوم کا بھلا ہوتا دکھائی دے۔پورے ہندوستان میں مسلمان کثیر تعداد میں موجود تھے،اگر وہ ایک قوت کے طور پر ابھرتے تب بھی زمانے کو قابو میں کر سکتے تھے،حکومت وقت کو اپنی خواہش کے مطابق احکامات کا پابند بنا سکتے تھے۔مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ نہ کثیر تعداد کا احساس تھا اور نہ ہی قوت کا صحیح اندازہ! لہٰذا ہر طرف سے ستم رانیوں کا شکار رہے۔سرسید تنہا نہیں تھے کہ جنھوں نے معصوموں کی جان بچائی ہو اور ان کی پذیرائی ہوئی ہو بلکہ اور بہت سے مسلمان اس فہرست میں شامل ہیں، سرسید تنہا نہیں تھے کہ جو منصب منصفی پر فائز تھے یا انگریزوں سے جن کے دوستانہ مراسم تھے بلکہ مسلمانوں کے کئی نام یہاں نظر آتے ہیں،سرسید تنہا نہیں تھے کہ جو ماقبل ہنگامہ غدر تصنیف و تالیف کے میدان میں معروف تھے بلکہ بہت سے مسلمان اس فہرست میں شامل تھے،سرسید تنہا نہیں تھے کہ جو ہندو مسلم بحیثیت ایک قوم سمجھتے تھے بلکہ بہت سے مسلمان اس فہرست میں شامل تھے،سرسید تنہا نہیں تھے کہ جو انگریزی عملداری میں نمو پاتی ہوئی ترقی کا مشاہدہ کر رہے تھے اور جس سے استفادے کے لیے اپنے آپ کو ہمہ وقت تیار پاتے تھے بلکہ بہت سے اور لوگ بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔لیکن اس بھرے پرے معاشرے میں، اس کثرت الرجال ہندوستان میں سرسید تنہا تھے جو دردمند دل رکھتے تھے،سرسید تنہا تھے جنھوں نے انصاف کا دامن کبھی نہیں چھوڑا،سرسید تنہا تھے جنھوں نے جب بھی پسماندگی کا احساس کیا اسے دور کرنے کے لیے عملی طور پر کمربستہ ہوئے،سرسید تنہا تھے جنھوں نے حق بات کے اظہار کے وقت یہ کبھی نہیں دیکھا کہ اس سے ان کے ہم مذہب برافروختہ ہو رہے ہیں یا حکومت وقت کی پیشانی شکن آلود ہو رہی ہے،سرسید تنہا تھے جو رات رات بھر روتے اور قوم کی خوش حالی کے لیے بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کرتے،سرسید تنہا تھے جنھوں نے کسمپرسی اور پژمردگی کی حالت میں پڑی ہوئی قوم میں حرکت و عمل کا صور پھونکا،سرسید تنہا تھے جنھوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعے حالات بدلنے کی کوشش کی،سرسید تنہا تھے جنھوں نے عملی میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے اور قوم کو تعلیمی سطح پر وسعت عطا کرنے کی کوششیں کیں،مسلمانوں کی انگریزوں سے روابط کی استواری میں سرسید کی کوششوں میں رسالہ ''رائل محمڈنز آف انڈیا''، ''تحقیق لفظ نصاریٰ''، انجیل کی تفسیر ''تبین الکلام''، رسالہ ''احکام طعام اہلِ کتاب''، خصوصی

اہمیت کے حامل ہیں۔انگریزوں کی نظر میں ہندوستان کے مسلمان سارے فساد کی جڑ تھے، دہشت گرد تھے، امن وآشتی کے دشمن تھے، انگریزوں کے نہ صرف سخت خلاف تھے بلکہ عدوِجان بھی تھے۔تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء کی اس پہلی جنگ آزادی میں ان گنت مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ یہاں قصور یا الزام کے ثابت ہونے یا نہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی، گنہگار ہونے کے لیے مسلمان ہونا کافی تھا، قابل تعزیر ہونے کے لیے مسلمان ہونا کافی تھا۔ دوسری طرف مسلمان بھی انگریزوں کو ازلی دشمن سمجھے ہوئے تھے۔ان سے جڑی ہر چیز سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ایسے شدت پسندانہ اور تعصّبانہ ماحول میں سرسید نے باہمی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا ۔انھوں نے تحریر وتقریر ہر دو ذرائع ابلاغ وترسیل سے امن قائم کرنے کی کوشش کی۔''لائل محمڈنز آف انڈیا'' میں انھوں نے ایسے مسلمانوں کی فہرست اوران کے کارنامے انگریزوں کے سامنے پیش کیے جنھوں نے گورنمنٹ کی وفاداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوئے تھے۔نصاریٰ لفظ انگریز اپنے لیے گالی سمجھتے تھے بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے برادران وطن لفظ کافر اپنے لیے مسلمانوں کی طرف سے گالی تصور کرتے تھے، سرسید نے انگریزوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کتاب ''تحقیق لفظ نصاریٰ'' لکھی جس میں انھوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے سب سے قریب قرار دیا ہے اوراس بات کی وضاحت کی ہے کہ مسلمان اس وقت تک ایمان کے زمرے میں نہیں آتا جب تک کہ وہ حضرت عیسیٰ کو نبی نہیں مان لیتا۔قرآن کی روشنی میں لفظ نصاریٰ کی تشریح کرتے ہوئے سرسید نے لکھا کہ یہ عیسائیوں کے لیے خوبی کے طور پر استعمال کی ہوئی اصطلاح ہے۔حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں اور وفاداراوران کے متبعین نصاریٰ کہلاتے تھے۔لہٰذا اس لفظ کا استعمال قابل تعزیر نہیں بلکہ قابل تعظیم ہے۔تفسیر ''تبین الکلام'' سرسید کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔''تحقیق لفظ نصاریٰ'' کی طرح یہ کتاب بھی انگریزوں کے اس نظریے کے رد میں کارآمد ثابت ہوئی کہ جس کی رو سے مسلمان انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن قرار دیے گئے تھے۔انگریزوں کی مذہبی کتاب کی تفسیر ہندوستانی زبان میں ایک مسلمان کے ہاتھوں رقم ہونا ایک معجزہ تھا۔بھنویں تنی ہوئی تھیں، رگیں پھولی ہوئی تھیں، آنکھیں شعلہ بار تھیں، ایک دوسرے کے لیے نفرت انتہاؤں کو چھو رہی تھی، ایسی تناتنی کے دور میں سرسید نے اس تفسیر کا بار سنبھالا، ان کی ذرا سی لغزش، ذرا سی لاپرواہی نہ صرف انھیں نقصان پہنچاتی بلکہ حکومت اور مسلمانوں کے بیچ دشمنی کی خلیج کو مزید گہری کر دیتی۔تاہم سرسید نے اس بارگراں کو اٹھایا اور کما حقہ اسے انجام تک پہنچایا۔تفسیر کے اس اہم کام میں سرسید نے انگریزی، عبرانی اور عربی کے عالموں سے مدد لی۔اردو تحریر کو انگریزی میں بھی ترجمہ کر کے شائع کیا۔اس تفسیر سے سرسید نے دو نہایت اہم مقاصد حاصل کیے۔ایک تو انگریزوں کے سامنے مسلمانوں کی شبیہ بہتر کرنا اور دوسرا مسلمانوں کو انگریزوں سے غیر ضروری مغائرت سے بچانا کہ وہ بھی اہل کتاب ہیں۔ باہمی مذہبی تنافر کے خاتمے کے لیے سرسید کی

ایک اور کوشش رسالہ ''احکام طعام اہلِ کتاب'' تھی۔اس کتاب کے مخاطب سرسید کے اپنے ہم مذہب تھے۔جو جہالت کی بنیاد پر انگریزوں سے رسم وراہ کو خلاف شرع سمجھے ہوئے تھے۔انگریزوں کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھانا نہ صرف معیوب تھا بلکہ کافی ثبوت آپ کے کرسٹان ہونے کا بھی تھا۔سرسید نے اس غلط فہمی اور کم ظرفی کے ازالے کی کوشش میں یہ رسالہ قلم بند کیا اور شرعی نقطہ نظر سے بھی یہ ثابت کیا کہ اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔اس طرح سرسید نے مخالفین کو موافقین بنانے کے عملی جتن کیے۔ابھی سرسید کا کام پورا نہیں ہوا تھا۔ان تمام کشاکشوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تعلیمی مرحلے میں بھی اپنی قوم کی ترقی کے خواب دیکھ رہے تھے۔سائنٹفک سوسائٹی،انسٹی ٹیوٹ گزٹ،تہذیب الاخلاق،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے روشن مینار سرسید کی جہد مسلسل اور ہمدردی قوم کی نشانیاں ہیں۔سر ولیم میور نے پیغمبر اسلام کی حیات پر ایک کتاب رقم کی۔مصنف نے اپنے ذرائع کا استعمال کر کے روایتیں جمع کیں اور اپنے طور پر ان کی تشریحیں نقل کیں۔گستاخانہ اندازِ نگارش اپنایا۔سرسید نے اس کا مطالعہ کیا اور اس کے جواب میں کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔اتفاق سے انھیں لندن کے سفر کا موقع ملا۔وہ وہاں گئے،کتب خانوں سے استفادہ کیا اور ضرورت کی کتابیں دنیا کے دوسرے ممالک سے منگوائیں اور ''الخطبات احمدیہ فی العرب وسیرۃ المحمدیہ'' نام سے بارہ خطبات پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی۔سرسید کہتے تھے کہ ''ولیم میور کی کتاب دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں،تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرتؐ کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جاوے۔اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔'' (خطوط سرسید مرتب سر راس مسعود خط بنام نواب محسن الملک خط نمبر ۸)

سرسید کی کتاب کے مطالعے کے بعد ولیم میور نے ایمانداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اندراجات سے رجوع کیا تھا۔موجودہ دور میں جب کہ وسائل آسانی کے ساتھ دستیاب ہیں،کسی بھی اعتراض کا جواب اسی انداز میں دینا دانش مندی کی دلیل ہے کہ جو انداز سرسید نے اپنایا تھا۔سوشل میڈیا پر یا کسی اور طور پر گستاخانہ تحریر پوسٹ کر دی جاتی ہے تو اس کا ردعمل یہ نہیں ہونا چاہیے کہ سوشل میڈیا کے بائیکاٹ کی مہم چلائی جائے یا اس کا استعمال بند کر دیا جائے۔یہ تو نادانی ہوگی۔دانائی یہ ہے کہ اسی سوشل میڈیا پر اس گستاخی کا منطقی اور صداقت پر مبنی جواب دیا جائے۔کسی بھی طرح کا جذباتی احتجاج بھی شدید نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔مخالفت میں کتاب لکھی گئی ہے تو آپ موافقت میں کتاب لکھ دیجیے۔قلم کا جواب قلم سے دیجیے۔سرسید کو کافر کہنے والے علما ولیم میور کی کتاب کا جواب نہیں لکھ پائے مگر جذبات کے بہاؤ میں قوم کو بہا لے جانے کے لیے سبقت لینے پہنچ گئے تھے۔آفریں ہے سرسید کو کہ انھوں نے ایسے فتوؤں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ان کا جواب صداقت پر مبنی،ان کا انداز منطقی اور ان کا دل اخلاص سے بھرا ہوا تھا چنانچہ ان کی کتاب اثر انگیز ثابت

ہوئی۔ سرسید نے تحقیق کو اپنا راہبر اور راہنما بنایا تھا اور مختلف شعبہ ہائے حیات کے مسائل اسی سے حل کیے، وہ چاہے مذہبی ہوں، تعلیمی ہوں، فرقہ وارانہ ہوں، سیاسی ہوں، تاریخی ہوں، تہذیبی ہوں۔ غرض تحقیقی رجحان ہر جا ان کے لیے مفید رہا۔ اس کی مدد سے وہ وسیع النظری اور کشادہ قلبی جیسی خوبیوں سے متصف ہوئے۔ میں ان کی تفسیر قرآن پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا کہ یہاں ان سے اتفاق و اختلاف کی گنجائشیں پیدا ہوں گی۔ تاہم یہاں بھی سرسید نے تحقیق کا سرا ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ البتہ کہیں کہیں منطق کی رو میں اس قدر بہہ گئے ہیں کہ اقرار و انکار کی حد ہی بھول گئے۔ قطع نظر اس کے سرسید کی ساری تحریریں ان کے سارے عملی تجربات ان کے نظریہ تحقیق کے باعث حیرت انگیز طور پر متاثر کن رہے ہیں۔

## 4.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ سرسید کی والدہ کے تعلق سے اپنی معلومات رقم کیجیے۔

۲۔ سرسید نے کن جگہوں پر ملازمت کی؟

۳۔ سرسید کی کتابوں کے نام لکھیے۔

۴۔ سرسید کے خطوط کس نام سے شائع ہوئے ہیں؟

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ سرسید کے خطوط کی معنویت پر ایک نوٹ لکھیے۔

۲۔ سرسید کی حیات و شخصیت پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

۳۔ سرسید کے عہد کی تصویر کشی کیجیے۔

۴۔ سرسید کی ادبی خدمات کا احاطہ کیجیے۔

(ج) سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی وضاحت کیجیے۔

۱۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پا جاویں کہ بلا ذریعہ نوکری خود اپنی قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں۔

۲۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔

۳۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میں انتقام لے سکتا ہوں اور قانونی سزا دلا سکتا ہوں۔ مگر میرے لیے کیا یہ مناسب ہوگا کہ

munotes.in

جس قوم کے ساتھ میں ہمدردی کرنا چاہتا ہوں اور جس قوم کو اپنی گود میں بٹھانا چاہتا ہوں، اس کو قانون کے حوالے کردوں۔

## 4.9 فرہنگ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| سریرآرا | تخت نشیں |
| پرآشوب | فساد سے بھرا ہوا |
| جلوہ گر ہونا | خاص انداز سے منظر عام پر آنا |

## 4.10 معاون کتابیں


| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | مطالعہ سرسید احمد خان | پروفیسر عبدالحق |
| ۲۔ | حیات جاوید | الطاف حسین حالی |
| ۳۔ | سرسید احمد خان اور ان کا عہد | ثریا حسین |
| ۴۔ | سرسید احمد خان: حالات و افکار | عبدالحق |
| ۵۔ | خطوط سرسید | سر راس مسعود |
| ۶۔ | مکتوبات سرسید | شیخ محمد اسماعیل پانی پتی |
| ۷۔ | سرسید کی نثری خدمات | ڈاکٹر مشتاق احمد |
| ۸۔ | سید احمد خان | خلیق احمد نظامی |
| ۹۔ | سرسید احمد خان ایک سیاسی مطالعہ | عتیق صدیقی |
| ۱۰۔ | ورق در ورق | ڈاکٹر مزمل سرکھوت |


☆☆☆

munotes.in

# نصاب

## مکتوبات غالب:

بنام:

۱۔علاؤالدین احمد خاں علائی

۲۔منشی ہرگوپال تفتہ

۳۔ میر مہدی حسین مجروح

## مکتوبات سرسید احمد خاں:

بنام:

۱۔ ایڈیٹر شمس الاخبار، مدراس

۲۔ مولوی عبدالحق

۳۔خواجہ الطاف حسین حالی

۴۔ ایڈیٹر پنجابی اخبار

۵۔مولوی سید امتیاز علی

۶۔ نواب انتصار جنگ بہادر

۷۔ عنایت اللہ

munotes.in

## مکتوباتِ غالب : بنام علاؤالدین احمد خاں علائی

(۱)

یار بھتیجے بھائی، مولانا علائی! خدا کی دہائی، نہ میں ویسا ہوں گا جیسا نیرؔ سمجھا اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی خفقانی اور خیال تراش، نہ ویسا ہوں گا جیسا مرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے:

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم، داند

دو جانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا، جن سے تمھارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دو جانہ جا کر شاگردی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرّہ نار ہو، لوہارو بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو؟

کل استاد میر جان صاحب نے تمھارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ مَیں نے ان کو جانے نہ جانے میں متردد پایا ہے۔ جائیں نہ جائیں، مَیں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ غلام حسن خاں اگر کسی وقت آجائیں گے تو ان کو تمھاری تحریر کا خلاصہ خاطر نشاں کر دوں گا۔ حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو دلّی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اُتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ ہاہاہا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آ گئی۔ وہ تمھارے عم نامدار کی نذر ہوئی۔ باقی جلدیں، جن کا مَیں خریدار ہوا ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے، جب تک قیمت نہ بھیج دوں، کیوں کر آئیں؟ روپے کی تدبیر میں ہوں۔ اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں۔ تمھارے پاس جو 'قاطع برہان' پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو، بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمیس ۱۹ رجون المبارک بارہ پر تین بجے تمھارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا اِدھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی آئے، تمھارا خط ان کو دیا، وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں، ہوا سرد چل رہی ہے۔

غالب

۱۹ رجون، ۱۸۶۲ء

(۲)

جانا عالی شانا!

خط آیا۔ خط اٹھایا۔ تمھاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں۔ تم کہیں، قبائل کہیں؛ والی شہر نا سازگار، انجام کار نا پائیدار، ایک دل اور سو آزار، اللہ تمھارا یاور، علی تمھارا مددگار۔ میں پا در رکاب، بلکہ نعل در آتش۔ کب جاؤں اور فلک سیر کو دیکھوں۔ ایک خط مَیں نے علی حسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اس کا جواب آ گیا۔ روہیلا پھوڑے پھنسی میں مبتلا ہے۔ خدا اُس کو صحت دے۔ شمشاد علی بیگ کہاں الور پہنچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے مل کر بھی نہ گیا۔ خیر!

رموز مصلحت خویش خسرواں دانند

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پُرنور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے اور بارہ پر دو بجے گئے شام خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں، خانساماں، خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ ٹپن، شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتش بازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، احکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر، مع صاحبان عالی شان کے، کل جائیں گے، کوئی کہتا ہے پرسوں۔ رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ، شکل، شمائل، بعینہ ضیاالدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعرفہم۔ سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اللھم دام اقبالہ، وزاد اجلالہ، بعد اختتام محافل طالب رخصت ہوں گا۔ بعد حصول رخصت دلّی جاؤں گا۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بشرط رسائی وتاب گویائی سلام کہنا اور بچوں کی خیر و عافیت جو تم کو معلوم ہوئی ہے، وہ مجھ کو لکھنا۔ ۶ر دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے۔

۶ر دسمبر، ۱۸۶۵ء

## بنام منشی ہرگوپال تفتہ

### (۱)

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ۔ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آپڑی ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور مَیں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مَیں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمھارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں، مَیں کیوں گھبراؤں گا؟ آپ اب جو جلد بہ سبیل ڈال میرے پاس بھیج دیجیے کہ مَیں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد ان کو تمھارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمھارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمھارے معنوی بچوں یعنی نتائج طبع کو فروغ، شہرت اور حسن قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط ان کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے، ان کو دے دیجیے گا۔ اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم کو آبو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا تا کہ مَیں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا

نگاشتہ جمعہ ۱۸/جون، ۱۸۵۲ء

اسداللہ

### (۲)

کیوں صاحب، اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی، نہ مرزا صاحب ہی آئے نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک بار منشی شیونرائن صاحب نے کرم کیا تھا اور خط میں رقم کیا تھا کہ اب ایک فرمہ باقی رہا ہے۔ اس راہ سے مَیں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرمہ نثر باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہوگا اور اگر فرمہ قصیدہ کا تھا تو اب جلدیں بننی شروع ہوگئی ہوں گی۔

تم سمجھے؟ مَیں تمھارے اور منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمھارا اور اُن کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے؟ اور کیا دیر ہے؟ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہوگئی؟ مرزا صاحب نے جلدیں صحاف کو دے دیں؟ اب میں ان کتابوں کا آنا کب تک تصور کروں؟ دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی۔ کہیں دیوالی کی تاریخ تک نو

بت نہ پہنچ جائے۔

ہاں صاحب، تم نے کبھی کچھ حال قمرالدین خان صاحب کا ذکر نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں ان کا آگرے کا آنا لکھا۔ پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے؟ وہاں تو منشی غلام غوث صاحب اپنا کام بدستور کرتے ہیں، پھر یہ اس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر معین ہو گئے ہیں؟ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے۔ مولوی قمرالدین خان صاحب اس کے بندوبست کو آیا چاہتے ہیں، اس کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔ جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیغام کہیے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے۔ آپ کی تخفیف تصدیع چاہتا ہوں، یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔ منشی شیونرائن صاحب کی عنایتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجیے گا اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا۔ چونکہ میرے خط کا جواب تھا اور معہذا کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اس واسطے اس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ، زیادہ۔

نگاشتہ ورواں داشتہ پنج شنبہ۔ ۱۶/ اکتوبر، ۱۸۵۸ء

غالب

(۳)

کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندرآباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔ بہ ہر حال:

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

کل جمعہ کے دن، ۱۲ تاریخ نومبر کی تینتیس جلدیں، بھیجی ہوئی برخوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا سب خوب، دل خوش ہوا اور نرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں، وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ منعلوم نہیں، منشی شیونرائن نے اندور کو واسطے امید سنگھ کے کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں۔

صاحب، تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو۔ سکندرآباد کب تک رہو گے؟ آگرہ کب جاؤ گے؟

جواب طلب، غالب

شنبہ ۱۳/ نومبر ۱۸۵۸ء

## بنام میر مہدی حسین مجروح

### (۱)

میری جان،

خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہونے کو آیا۔ داڑھی میں بال سفید آ گئے، مگر بات سمجھنی نہ آئی، پنسن کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بے جا اُلجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلّی کہ سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے۔ چند اشخاص کو بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں آیندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعہ سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں؟ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہی:

چیل بسولا لے گئی تو کاہے سے پھنکوں راب؟

علی بخش خاں پچاس روپے مہینے پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپیہ مل گیا، باقی روپیہ چڑھ رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خان، سو روپیہ مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو روپے ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینہ، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں، اس کو اٹھارہ سو روپے ملے۔ مناجمعدار دس روپیہ مہینے کا سکہ لمبر۔ سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔ میں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ مَیں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینے پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلّی کے حمقا، جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔ اب وہ جب معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

غالب

فروری ۱۸۵۹ء

(۲)

میری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سودیوانہ۔ صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا جو تم کو سمجھاتے ہو؟ کیا مَیں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش مَیں کرتا ہوں؟ استغفر اللہ، لامؤثر فی الوجودہ اِلّا اللہ۔ یا تم یہ سمجھتے ہو کہ مَیں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور اس کے انڈے بچے کر بکری خرید کروں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہوگا؟ بھائی یہ تو مَیں نے اپنا راز دل تم سے کہا تھا کہ آرزو یوں ہی تھی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا، نہ خواہش کا۔

دیکھا، اس پنسن قدیم کا حال؟ مَیں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ لیکن جب تک جواب نہ پاؤں، کہیں اور کیونکر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے، دیکھیے کب آئے؟ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے؟ خلعت ملے یا نہ ملے؟ اس بیچ میں ایک اَور پیچ آ پڑا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر اسی کی انتظار نہیں، اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنسن ملنے نہ ملنے کا تردد بدستور رہے گا۔ سبک سر کیوں کر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ پنسن جاری ہونے پر بھی تو سوا رامپور کے ٹھکانا نہیں۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثبات قدم اختیار کیا۔ اب انجام کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے، ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب، میرن صاحب نے دو سطریں دستخط خاص سے لکھی تھیں۔ واللہ مَیں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمے کا ذکر ہے۔

غالب

(۳)

میاں،

کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں اُن کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی تھیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی تھیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا تھا چیخنے کو مگر ناچار چپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔

امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنی جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا کہ یہی ہوگا کہ میرن صاحب بات تم سے چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے، ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تو دۂ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے۔ ''بھائی میں دلّی سے آیا ہوں اور قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں۔'' زنہار باور نہ کیجیو مال مفت سمجھ کر لیجو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ میں گنگا جلی دو، بلکہ مَیں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا، اور سنو، مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک ان کو پہنچا گئے۔ رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون بُرا اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں، عورتیں صدقہ جاتی ہیں۔ مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلما مولوی سرفراز حسین کو میری دعا کہنا کہ حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں، کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہے، خدا کے بعد نبیؐ اور نبیؐ کے بعد امام، یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام، علی علی کیا کر فارغ البال رہا کر۔

غالب

مئی ۱۷۶۱ء

☆☆☆

# مکتوبات سرسید احمد خاں

## بنام ایڈیٹر شمس الاخبار، مدراس

مخدوم ومکرم بندہ ایڈیٹر شمس الاخبار مدراس سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون التماس یہ ہے کہ میں آپ کے اخبار میں محمد یٰسین خانصاحب کے اور ایک کسی دوسرے صاحب مقیم حیدرآباد کے خطوط نسبت مدرستہ العلوم مسلمانان کے دیکھتا ہوں اور اخبار مطبوعہ نمبر ۱۹ میں بھی ان کا خط دیکھا ہے۔ وہ ارقام فرماتے ہیں کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں بنظر بہبودی اہل اسلام لکھتے ہیں نہ میری عداوت سے کیونکہ انھوں نے مجھے دیکھا بھی نہیں ہے۔ میں بھی ان کی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ اگرچہ ان کو وہ خیالات جو انھوں نے بدلائل و براہین خیالیہ میری نسبت قائم کیے ہیں، خود ان کی تحریر کے منافی ہیں، لیکن جو کہ میں نہ کسی کا دشمن ہوں اور نہ کسی کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں تو میں ایسے بزرگ کو جو خود فرماوے کہ مجھے عداوت نہیں، میں کیوں اپنا عدو سمجھوں۔

میری عادت کسی کی تحریر کے جواب دینے کی نہیں۔ البتہ جو لوگ درحقیقت بلاتعصب اور بلانفسیات صرف قومی بھلائی کی غرض سے کچھ کہتے ہیں، ان کا جواب دینے میں اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ حیدرآبادی صاحب کا یہ قول ہے کہ وہ بھی اسی نظر سے کہتے ہیں اس لیے ایک بات جو میرے نزدیک معقول اور قول فصیل ہے، ان کی اطلاع کے لیے لکھنا چاہتا ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ ان صاحب نے قومی معاملات اور شخصی بحث کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ اگر ہم ان دونوں باتوں میں تمیز نہ کریں گے تو قومی بھلائی کی توقع منقطع ہو جائے گی۔

ہندوستان میں غالباً مسلمانوں کے چار فرقے ہیں، شیعہ، بدعتی اور وہابی چوتھا فرقہ نے میں ان لامذہب بے دینوں کا گن لیا جن میں ان حیدرآبادی صاحب نے مجھ کو اور میرے دوستوں کو اور جو ہماری تائید کرے، اس کو شمار کر لیا ہے۔ اب جو کوئی شخص مسلمانوں کی بھلائی و بہتری میں کوشش کرنے کو آمادہ ہوگا وہ انھیں میں سے ہوگا۔ اب فرض کرو کہ بدعتی فرقے سے ایک شخص اس کام کے لیے آمادہ ہوا تو اس کی نسبت وہابی اور شیعہ اور وہ چوتھا فرقہ ضالہ اسی قسم کی باتیں کہے گا جو حیدرآبادی صاحب ہماری نسبت کہتے ہیں۔ اگر کوئی وہابی اس کام کے لیے کھڑا ہوا تو خدا کی پناہ حیدرآبادی صاحب ہی کی لعنت ملامت سننے سے فرصت نہ ملے گی اور اگر کوئی شیعہ کھڑا ہوا تو جو اس کام کا حال ہوگا، آپ خیال کر سکتے ہیں اور اگر کوئی چوتھے فرقے کا گمراہ آن کھڑا ہوا تو بجز سنگسار کرنے اور کچھ نہ ہوگا، اور نتیجہ اس شخصی بحث کا یہ ہوگا کہ قومی

بھلائی معدوم ہوجائے گی اور ہماری قوم اس ذلت خواری میں پڑی رہے گی جس میں اب ہے پس قومی معاملات میں شخصی بحث کرنا اہل اسلام کی بھلائی میں داخل نہیں ہے بلکہ سخت دشمنی ہے۔

مدرستہ العلوم قومی مدرسہ ہوگا جس میں عموماً ہر فرقے کے لوگ تعلیم پاویں گے۔ اگر میرے ذاتی مذہب اور میرے ذاتی خیالات پر بحث کی جاوے گی تو ایک دن بھی کام نہیں چل سکے گا۔ پہلے بسم اللہ شیعہ فرماویں گے کہ اس کا بانی ایک سنی، کافر، ناصبی، دشمن اہل بیت ہے، (نعوذ باللہ منھا) اس سے ڈرو اور کبھی شریک مت ہو۔ پس جس طرح کہ شیعہ مجھ کو راہ حق پر یقینی نہیں سمجھتے، سنی بھی نہ سمجھیں اور میرے ذاتی عقائد اور مذہب اور خیالات اور رائے سے بحث نہ کریں، بلکہ جو قومی معاملات ہیں ان پر قومی معاملات کی طرح بحث کریں۔ وہ دیکھیں کہ کمیٹی میں جو لوگ ممبر ہیں ان میں شیعہ اور وہابی اور بدعتی اور بے دینے سب داخل ہیں یا نہیں۔ وہ دیکھیں کہ دنیاوی علوم کی تعلیم جو تمام قوم کے لیے تجویز کی گئی ہے اور جس کے بغیر دنیاوی عزت اور دولت اور قومی ترقی غیر ممکن ہے، وہ تمام قوم کے مناسب ہے یا نہیں۔

شیعوں کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو مذہبی تعلیم ان کے لیے تجویز ہوئی ہے وہ ان کے مذہب کے مطابق ہے یا نہیں۔ سید احمد کے مذہب اور اس کے عقائد اور خیالات سے ان کو کیا مطلب ہے ورنہ مجھ کو تو قومی بھلائی کے لیے کوشش کرنے کا دعوا کرتا ہوں، بڑی مشکل پڑے گی۔ شیعوں کے خوش کرنے کو مجھے شیعہ ہونا پڑے گا، بدعتیوں کے خوش کرنے کو بدعتی اور وہابیوں کے خوش کرنے کو وہابی اور بے دینوں کے خوش کرنے کو بے دین۔ پس ایسی آفت کس سے سہی جاسکتی ہے۔

اگر حیدر آبادی صاحب درحقیقت اہل اسلام کے خیر خواہ ہیں اور کسی سے کچھ عداوت ذاتی یا مذہبی نہیں رکھتے، وہ ہماری ذاتی بحث سے ہم کو معاف فرماویں اور نہ کسی ہمارے خاص عقیدے یا رائے کو مدرستہ العلوم کے کاروبار سے متعلق کریں۔ اپنا نام ہم کو بتلادیں، ہم سے خط و کتابت جاری کریں، تمام روئداد کمیٹی کی ہم سے طلب کریں اور جو تجویز کمیٹی کی نسبت مدرستہ العلوم کے قرار پاوے، اس کو بغور دیکھیں اور جس تجویز کو برخلاف مذہب اسلام پاویں اس پر بے تعصبی سے بحث کریں، اس کی اصلاح پر سعی فرماویں اور دیکھیں کہ کمیٹی کس احسان مندی سے ان کی نصائح پر توجہ کرتی ہے۔ سوائے اس کے کوئی طریقہ اختیار کرنا محض بے فائدہ ہے اور اس بات پر بحث کرنے سے کچھ نتیجہ نہیں ہے۔ یہ تو بارہ سو برس سے ہوتی آئی ہے اور شاید یوں ہی ہوتی چلی جاوے گی جب تک کہ وہ حدت کا زمانہ آوے گا۔

یہ چند سچی اور سیدھی باتیں ہیں جو میں نے عرض کیں۔ اب حیدر آبادی صاحب چاہیں قبول کریں چاہیں قبول نہ کریں۔ وآخر کلامی ان الحمد اللہ ورب العالمین۔ والسلام۔

خاکسار

سید احمد، بنارس

۱۷ مئی، ۱۸۷۳ء

(۲)

## بنام مولوی عبدالحق

مخدوم ومکروم من جناب مولوی عبدالحق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ آپ کو جو عنایت نامہ میرے نام سید الاخبار دہلی نمبر ۱۷ میں چھپا ہے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ آپ جو یہ استفسار فرماتے ہیں کہ مدرستہ العلوم مسلمانان میں کون سے علوم ہوں گے جن سے اہل اسلام ترقی دنیا حاصل کریں گے۔ اگر آپ ازراہِ عنایت اس طریقۂ تعلیم مسلمانان پر غور فرمائیں گے جو کمیٹی میں پیش ہوا ہے اور ہمراہ پرچہ تہذیب الاخلاق مطبوعہ ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ ہجری تقسیم ہوا ہے تو آپ کو ان سب علوم کا جو مدرستہ العلوم مسلمانان میں پڑھانے تجویز ہوئے ہیں، بخوبی حال معلوم ہو جاوے گا اور اس وقت آپ یہ رائے قائم فرما سکیں گے کہ ان علوم کو پڑھنے سے دین اور دنیا دونوں میں ترقی ہونے کی امید ہے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مدرستہ العلوم کی تعلیم سے ہاتھ آنا سرکاری نوکریوں کا اصلی مقصود ہے، اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ سرکار میں اتنی نوکریاں کہاں ہیں جو سب مسلمانوں کو دے گی۔

جناب من آپ نے مقصود مدرستہ العلوم پر غور نہیں فرمایا۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان علوم وفنون میں ایسی تعلیم پا جاویں کہ بلا ذریعہ نوکری خود اپنی قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور جو کہ مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لیے مستقل مدرسے کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔

آخر کو جو آپ نے نصیحت ناپائیداری دنیا لکھی ہے اور ارقام فرمایا ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ ہر دم کو دم واپسیں جانے اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ بلاشبہ یہ عمدہ نصیحت ہے مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس کو ہر کوئی اعلا وادنا عالم وجاہل سب جانتے ہیں مگر افسوس کہ کرتا کوئی نہیں۔ اگر آپ خود ہی اس پر عمل رکھتے ہوتے تو اخیر خط میں یہ ارقام نہ فرماتے کہ 'نحن منتظر الجواب' کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ آپ میرا جواب پہنچنے تک زندہ رہیں گے، اس وقت آپ کو اپنی اس نصیحت کا کہ ہر دم کو دم واپسیں جاننا چاہیے، کیوں نہ خیال رہا۔

مجھ سے آپ سے ملاقات نہیں ہے اور نہ آپ کے حال سے واقف ہوں اس لیے میں نہیں جانتا کہ آپ کس حال میں ہیں۔ مگر میں نہایت ادب اور عاجزی سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اپنے رہنے کے لیے کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بھی بنوائی ہے، برسات کی تکلیف سے بچنے کے لیے کبھی گھر کی چھت پر مٹی ڈلوائی ہے۔ کبھی اپنے رہنے کے لیے چھپر ڈلوایا ہے، آپ کے پاس پہننے کے لیے جوڑے ہیں جن میں سے ایک آدھ تو آپ پہنے ہوئے ہوں گے۔ اور باقیوں کو

آئندہ پہننے کے لیے رکھا ہوگا۔ کم سے کم نان بائی یا بھٹیارے کو صبح وشام کی روٹی پکانے کا حکم دیتے ہوں گے اور اس ماہ مبارک رمضان میں سحری کے لیے بھی کچھ ضرور اُٹھا رکھتے ہوں گے، مگر آپ کو اس نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق ہوتا کہ

ع شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود پس

جس بات پر کہ آپ کبھی عمل نہیں فرماتے، دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں نصیحت فرماتے ہیں۔ جناب ایسی باتیں کہہ دینی اور لکھ دینی بہت آسان ہیں مگر اس پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔

بندے نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کو جوتیاں سیدھی کی ہیں، مگر 'ابیض نورانی' کا سب کو محتاج پایا۔ پھر بھلا آپ ایسی باتیں جاہل مسلمانوں کے برباد کرنے کو کیوں فرماتے ہیں۔ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے۔ جس سے خدا اور رسول نے منع فرمایا اس سے ہم کو پرہیز کرنا چاہیے۔ جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لیے حلال ومباح اور خدا کی نعمت ہے۔ ہم کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی متابعت میں خدا کی نعمتوں کو لوٹنے دو برائے خدا، آپ کا کیا نقصان ہوتا ہے۔ وہ تو ہمارے خدا کی نعمتیں ہیں، اس نے ہمارے لیے بنائی ہیں پھر ہم نہ لوٹیں گے تو کون لوٹے گا۔ ہاں خدا سے یہ دعا مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب مغرور ہو جاویں اور اپنے خدا کو جس نے نعمتیں ہمارے لیے وقف کر دیں نہ بھول جاویں۔

مروت کا مقتضا یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی بھلائی پر کوشش کرے۔ پس آپ بھی اپنے بھائی مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشش کیجیے اور لوگوں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان کے لیے للہ چندہ مانگتے پھریے اور جمع کر کر میرے پاس بھیجتے جایئے۔ حقیقت میں یہ بات ہر دم کو دم واپسیں سمجھنے پر عمل کرنے کہ ہوگی کیونکہ وہ کام اپنے لیے نہ ہوگا بلکہ دوسروں کے لیے ہوگا۔

امید ہے آپ میری اس عرض پر دلی توجہ دیں گے۔

السلام علی من اتبع الھدی

رقم آثم

سید احمد، بنارس

۵ رنومبر، ۱۸۷۳ء

munotes.in

(۳)

## بنام خواجہ الطاف حسین حالی

جناب مخدوم ومکرم من!

عنایت نامجات بمع پانچ جلد مسدس پہنچے۔جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بلکل بجا ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دوراز کار سے جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے بلکل مبرا ہے، کیونکہ ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اُس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اُس میں پائی جاتی ہے تو صرف اُنھی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اُس کو میں نے اپنے اُن اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔آپ نے یہ نہیں ارقام کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمایئے۔یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں۔

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ دار یا اُن کے ماتم مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے۔جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں۔قوال درگاہوں میں گاویں۔حال لانے والے اس سچ حال پر حال لاویں اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیوں نچواؤں مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔میرے اُن استفسار کا جواب جن پر نشان درج کر دیا ہے بہت جلد مرحمت ہو۔والسلام

خاکسار

آپ کا احسان مند تابعدار

سید احمد

شملہ- پارک ہوٹل

۱۰/جون، ۱۸۷۹ء

(۴)

## بنام ایڈیٹر پنجابی اخبار

بخدمت ایڈیٹر پنجابی اخبار، لاہور

صاحب من۔آپ نے اپنے اخبار مطبوعہ ۲۰ رجولائی میں جو آرٹیکل نسبت مدرستہ العلوم کے بنظر قومی ہمدردی کے لکھا اس کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں کہ چند لفظ آپ کی خدمت میں لکھوں۔

میں اپنے ان مہربان دوستوں کا جو میری ذاتی مخالفت پر سرگرم ہیں اور گو کہ وہ ان باتون میں جو میری ذات سے علاقہ رکھتی ہیں، کتنا ہی مبالغہ کرتے ہیں اور لوگوں کو مغالطہ دیتے ہیں اور بے سروپا اتہام کرتے ہیں، ہمیشہ ممنون رہا ہوں اور رہوں گا۔ان کا ناراض ہونا اور غصے میں آکر حد سے تجاوز کر جانا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ان کے خیالات میرے خیالات سے بلکل مختلف ہیں۔وہ میرے مذہبی لحاظ سے کفر والحاد و زندقہ وارتداد سمجھتے ہیں۔(گو فی نفسہ کیسے ہی عمدہ ہوں) پھر ان کی مخالفت سے اگر میں آزردہ ہوں تو میری نادانی ہے۔میں اپنے قدیم دوست مولوی حاجی سید امداد العلی خاں بہادر، سی۔ایس۔آئی۔سے اسی خلوص سے ملتا ہوں۔جیسا کہ ہمیشہ ملتا تھا اور آپ کے شہر کے مشہور عالم مولوی ابو سعید محمد حسین صاحب کی (جن کو دو ایک دفعہ اتفاقیہ دیکھا ہے) ایسی ہی قدر کرتا ہوں جس قدر کہ وہ لائق ہیں۔مجھ کو مطلق اس بات کا خیال نہیں ہے کہ یہ دونوں صاحب میری نسبت کیا لکھتے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔خیال تو درکنار میں ان صاحبوں کی تحریروں کو اور مثل اس کے جو اور تحریریں ہیں، کبھی آنکھ بھر کر دیکھتا بھی نہیں۔بعض اخباروں نے یہ سمجھا ہے، اور ان کی سمجھ درست ہی ہے کہ میری ہجو و دشنام دہی و سخت کلامی سے ان کے اخبار کے چند پرچے فروخت ہو جاتے ہیں۔نہایت خوش ہوں کہ وہ اپنے جوہر ظاہر کریں اور طبع آزمائی اور ذکاوت کو میری ہجو میں خرچ کریں اور اس سے خذف چند حاصل کریں۔

اس تمہید سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں آگے لکھتا ہوں اس میں ان باتوں کو جو میری ذات کی نسبت کہی جاتی ہیں، میں شامل نہیں کرتا۔

مدرستہ العلوم کوئی میرا ذاتی کام نہیں ہے۔جہاں تک میری سمجھ ہے، میں اس کو اپنی قوم کے لیے فائدے مند سمجھتا اور جو کچھ اس میں کوشش کی جاتی ہے وہ قومی کام ہے۔پس مدرستہ العلوم سے مخالفت کرنا البتہ مجھے تعجب میں ڈالتا ہے اور قومی ادبار پر افسوس آتا ہے۔اگر وہ مخالفت ایک رائے کے اختلاف پر مبنی ہوتی اور جو کاروائی مدرستہ العلوم میں ہوتی ہے اس میں نقص نکالے جاتے اور اصلاح پر رائے دی جاتی تو اس سے زیادہ کوئی خوشی کی بات نہ تھی۔مگر جب وہ اس

میں کوشش کی جاتی ہے وہ قومی کام ہے۔ پس مدرستہ العلوم سے مخالفت کرنا البتہ مجھے تعجب میں ڈالتا ہے اور قومی ادبار پر افسوس آتا ہے۔ اگر وہ مخالفت ایک رائے کے اختلاف پر مبنی ہوتی اور جو کاروائی مدرستہ العلوم میں ہوتی ہے اس میں نقص نہیں پاتے تو غلط بیانی اور بہتان بندی اور اتہام سے کام لیتے ہیں اور اس پر نہایت فخر کرتے ہیں۔ بلاشبہ جھوٹا موتی آب وتاب میں زیادہ ہے مگر کئی دن کا، پھر جھوٹا جھوٹا ہے دو دن بعد نہ وہ آب وتاب ہے نہ وہ چمک دمک۔ پنجاب کے بعض دوستوں نے مجھ سے بہت اصرار کیا ہے کہ اگر تم اپنی ذات کے لیے انتقام لینا نہیں چاہتے تو مدرستہ العلوم کی نسبت جو مخالفین اتہام لگاتے ہیں، ان کا انتقام ضرور لو۔ میں بھی کچھ سمجھتا ہوں اور کسی قدر قانون سے بھی واقف ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میں انتقام لے سکتا ہوں اور قانونی سزا دلا سکتا ہوں۔ مگر میرے لیے کیا یہ مناسب ہوگا کہ جس قوم کے ساتھ میں ہمدردی کرنا چاہتا ہوں اور جس قوم کو اپنی گود میں بٹھانا چاہتا ہوں، اس کو قانون کے حوالے کر دوں۔

مجھ کو یاد ہے کہ ایک شخص نے جس کے ساتھ میں نے نیکی کی تھی، میرے ساتھ نہایت بدی کی اور تمام وجہ ثبوت جس سے اس کو فوجداری عدالت سے کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ آ گئی۔ میرے نفس نے مجھ کو بہکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ مرحومہ نے یہ خبر سُن کر مجھ سے کہا کہ اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست احکم الحاکمین، کے چنگل سے جو ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے، اپنے دشمن کو چھڑا کر ضعیف و ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ میں ڈالنا چاہتے ہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔

اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہے کہ کبھی دور نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ پس اگر میں ان لوگوں سے انتقام لینے کا خواہش مند ہوں تو بہتر ہے کہ دنیوی حاکم کی بہ نسبت اس قوی حاکم کے حوالات میں ان کو رہنے دوں۔ وہ اس اتہام اور بد گوئی سے کیا نتیجہ اٹھاتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ان کی ایسی باتوں پر لعنت کرتے ہیں اور ضرور بہت جلد ایسا زمانہ آوے گا کہ قوم کی قوم ان کی ان باتوں کو یاد لعنت کیا کرے گی۔ پس کیا سزا کم ہے کہ اس کے سوا اور کی فکر کی جاوے۔ ہمارے دوستوں کا یہ خیال کہ ان کے ان اتہامات اور فحش سے مدرستہ العلوم کو نقصان پہنچے گا۔ میری رائے میں درست نہیں ہے۔ مدرستہ العلوم چل نکلا اور چلے گا۔ تمام اتقیا اور رؤسا نے دیکھا اور تجربہ کیا۔ اب وہ کسی کی بد گوئی اور فحش اتہامات سے رک نہیں سکتا۔ ہاں جس کسی کو لعنتی کا طوق پہننا خوش آتا ہو وہ جو چاہے کہہ لے اور کر لے۔

جن لوگوں نے مدرستہ العلوم کے طالب علموں کی نسبت فحش لگائے اور اشعار بنائے، اخباروں میں چھاپے، اور اگر وہ سب صحیح تسلیم بھی کر لیے جاویں تو اس کا نتیجہ کیا ہے؟ یہی نتیجہ ہے کہ ہماری قوم کی اولاد کی ایسی خراب حالت ہے جیسی کہ وہ بیان کرتے ہیں۔ مدرستہ العلوم میں جو لڑکے آتے ہیں وہ وہی ہیں جنھوں نے اپنے ماں باپ کے ہاں اپنے گھروں

پر اس وقت تک کہ وہ مدرسے میں آویں، تربیت پائی ہے۔ یا جو افعال کہ ان کے ہون وہ نتیجہ اس تربیت کا ہے جو ہماری قوم کے لڑکے اپنے گھروں پر پاتے ہیں۔ پس جو کچھ کہ وہ لوگ کہتے ہیں وہ نقائص اگر ہوں تو مدرستہ العلوم کی نسبت منسوب نہیں ہوسکتے۔ بلکہ قوم کی حالت پر منسوب ہوتے ہیں اور جس شخص کو خدا نے عقل اور قومی ہمدردی عطا کی ہے، اس کے نزدیک قوم کی اولاد کے لیے تربیت کی فکر کرنا بہت بڑا اہم امر ہوتا جاتا ہے۔ مگر وہ تربیت اور شخصیتوں کی فحش تحریروں سے نہیں ہوسکتی جنھوں نے فحش اتہام کرنے اور فحش اشعار نظم کرنے میں اپنی ذہانت وجودت طبع کو کام میں لایا ہو، بلکہ ان کی تربیت کے لیے ایک ایسی ہی تعلیم گاہ کی ضرورت ہے جیسی کہ مدرستہ العلوم ہے۔ پس عقلمند دوراندیش آدمی کے دل میں ان کے اتہامات کے صحیح مان لینے کے بعد بھی مدرستہ العلوم کی قدر منزلت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

عدد شود سبب خیر گر خدا خواہد

راقم

سید احمد، علی گڑھ

۲۴/جون، ۱۸۸۱ء

(۵)

## بنام مولوی سید امتیاز علی

محبّی و مشفقی، عنایت نامہ پہنچا اور حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ آپ کی ملاقات کو دل چاہتا تھا۔ اس تعطیل میں نہ آنا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوا۔ موسم اچھا نہیں ہے۔ تعطیل دسمبر میں ضرور تشریف لائیے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیٹھنے باتیں کرنے، سیر کرنے سب کے لیے اچھا موسم ہوگا۔ کیا ہے کہ اس زمانے میں کوئی جلسہ کمیٹی بھی ہو۔

ہم ہندوستانیوں کی تمام مجلسیں بے جان ہیں۔ یا تو ان میں کام نہیں ہوتا یا کسی یوروپین افسر کے ہاتھ فرخت ہوجاتی ہیں اور اس کے مقاصد یا رائے کی تکمیل کی بھی آلہ بن جاتی ہیں۔ یہ قوت میں ہے کہ ہم اپنا کام اپنی رائے اور اپنی قوت سے چلا دیں۔ ہم سے اور مسٹر کیمسن صاحب ڈریکٹر پبلک انسٹرکشن سے نہایت نا موافقت تھی۔ ملاقات اور صاحب سلامت بھی نہ ہوتی تھی۔ ہمارے تمام کاموں کے وہ برخلاف تھے۔ سبب صرف یہ تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ سائنٹفک سوسائٹی اور مدرستہ العلوم ان کے قبضے میں ہو اور ہم صرف ان کے ہاتھ میں بطور ایک آلے کے ہوں۔ ہم نے نہایت استقلال سے کسی بات میں دخل دینے نہیں دیا اور خود آپ اور اپنی رائے سے اور اپنی رائے سے اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے کام چلایا اور میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرستہ العلوم کا جو کچھ

حال ہوسو ہومگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اورلوگوں کے قبضے میں چلا جائے۔ بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔لوگ عام فائدے کے کاموں میں حکام کے سامنے بھی اپنا سوخ چاہتے ہیں مگر حقیقت میں اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔ہم اس ضلع کے حکام کا نہایت ادب کرتے ہیں۔تما جلسوں میں انہی کوافسر بناتے ہیں۔انعام انہی کے ہاتھ سے تقسیم کرواتے ہیں۔مگر ہمارے کام میں ان کوایک نقطہ برابر بھی مداخلت نہ ہوئی۔ وہاں کے حالات نہایت افسوس کے قابل ہیں مگر ''خود کردہ رادر ماں نیست'' جس کام سے قوم کا فائدہ مقصود تھا، اپنے ہاتھوں اس کوقوم کے لیے زہر بنالیا۔ ہمارا کالج فضل الٰہی سے نہایت ترقی پر ہے، مکانات کی نہایت قلت ہوگئی اس لیے داخلہ روک دیا گیا ورنہ اس وقت چارسو سے زیادہ طالب علم ہوتے، والسلام۔

خاکسار

سید احمد، علی گڑھ

۸/اگست ۱۸۸۱ء

(۶)

## بنام نواب انتصار جنگ بہادر

عزیزی ومکرمی نواب انتصار جنگ بہادر،

شاید آپ کو یہ بات معلوم ہوگی یا نہیں کہ ایک عرصے سے جب کہ مولوی مہدی علی ولایت بھی نہیں گئے تھے، میں ان کو یہ تاکید صلاح دیتا رہا کہ اب نوکری سے علیحدہ ہوکر بقیہ زندگی میرے ساتھ علی گڑھ میں بسر کرنی چاہیے۔آدمی اس واسطے پیدا نہیں ہوا کہ تمام عمر غلامی میں بسر کرے اور کسی وقت خاص میں اپنے دل کی خوشی اور آزادی میں اپنے تئیں نہ ڈالے۔ تابع داری خاص دلی حرکتوں پر پردہ ڈالے رکھتی ہے۔ میں اس شخص کو نہایت بدنصیب سمجھتا ہوں جس کے دل پر تابہ مرگ وہ پردہ پڑا ہے اور خاص دل کی حرکتوں کو جو بجز آزادی کے اور کسی حالت میں ابھرتی نہیں، ابھرنے نہ دے۔

خیر میری یہ رائے ہے اور آپ یقین کرتے ہوں گے کہ مہدی علی کو نہایت عزیز رکھتا ہوں بلکہ چاہتا ہوں اور جو شخص جس سے محبت رکھتا ہے وہ ضرور اس کے لیے وہی چاہتا ہے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے اب مجھ کو معلوم ہوا کہ مولوی مہدی علی نے استعفادے دیا ہے، مگر آپ اس خلل انداز ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ اگر تم نوکری چھوڑ دو گے تو میں بھی نوکری چھوڑ دوں گا۔ میں تم کو بھی کسی وقت یہی نصیحت کروں گا جو مہدی علی کو کرتا ہوں مگر تمھارے لیے ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ بہر حال تمھارا یہ کہنا کہ میں بھی نوکری چھوڑ دوں، مہدی علی کے استعفے منظور ہونے میں پورا خلل ڈالنا ہے۔ کیونکہ دونوں کا

ایک ساتھ علیحدہ ہونا محالات سے ہے، غالباً آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہوگا کہ لوگ آپ کو بدنام کریں گے، کہ آپ مہدی علی کے استعفا دینے کے باعث ہوئے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت میرے نصائح نے ان پر پورا اثر کیا ہے اور دل سے وہ اب نوکری سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ لوگ دنیا میں کسی کو چین لینے نہیں دیتے۔ پھر لوگوں کے کہنے پر خیال کرنا محض لغو ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو کام میں نے صرف خالص نیت اور صرف قومی بھلائی کے لیے کیا ہے اس نسبت لوگ اور بہت مقدس لوگ کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ کیسے کیسے مقدس لوگ مجھے خودغرض، بددیانت، تعمیرات مدرستہ میں غبن اور چوری کرنے والا وغیرہ وغیرہ بیان کرتے ہیں اور مقدس ہاتھوں سے جو پانچ وقت وضو سے دھوتے ہیں، ایک سلسلہ آرٹکلوں، پمفلٹوں کا چھپ رہا ہے اور مشتہر ہو رہا ہے۔

پس آدمی کو اپنے خدا کے سامنے نیک نیتی سے کام کرنا چاہیے لوگوں کے کہنے پر مطلق خیال کرنا غلطی ہے۔ پس اس طرح آپ کو بلحاظ اس کے کہ لوگ کیا کہیں گے، مولوی مہدی علی کے استعفے کی منظوری کے لیے کوشش کرنی چاہیے نہ کہ خلل انداز ہونا۔ بلاشبہ اس وقت آپ کو خدا نے اختیار دیا ہے اور محبت کا مقتضا یہ ہے کہ آپ مہدی علی کے ساتھ سلوک کریں اور وہ سلوک یہ ہے کہ گورنمنٹ سے ایک معقول و مناسب پنشن ان کو دلوا دیں۔ آپ کی سعی سے بلاشبہ یہ ہوسکتا ہے اور آسانی سے ہوسکتا ہے۔ یہ بھی آپ کو یقین ہوگا کہ بعد منظوری پنشن و استعفا فی الفور مہدی علی حیدرآباد سے علی گڑھ چلے آویں گے اور میرے ساتھ رہیں گے جس کے لیے میں نے بندوبست کر رکھا ہے اور بقیہ عمر میرے ساتھ علی گڑھ میں گزاریں گے۔ یا میں ان کو دفن کروں گا یا وہ مجھ کو دفن کریں گے اور بقیہ عمر گوشہ نشینی اور خاموشی میں بسر کریں گے۔ پس جب کہ ان کا یہ ارادہ ہے جس پر میں یقین کرتا ہوں تو اس میں خلل انداز ہونا کچھ سلوک نہیں ہے بلکہ درحقیقت بدسلوکی ہے۔ آپ کے اصرار کا اور ان کی منظوری استعفا اور تقرر پنشن میں سعی نہ کرنا یا اس میں خلل انداز ہونا شاید آپ بہ مقتضائے محبت و دوستی ایسا کرنا سمجھتے ہوں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جب اُنھوں نے ایسا ارادہ مصمم کر لیا ہے تو ایک دن وہ چھوڑ چھاڑ کر چلے آویں گے، گو کہ ایسا کرنے میں شاید ان کو نقصان پہنچے۔ مگر جب کوئی شخص کچھ کرنے پر آتا ہے تو کر ہی بیٹھتا ہے۔ اس وقت البتہ آپ کو لوگ بدنام کریں گے اور میں بھی آپ کی نہایت شکایت کروں گا۔

مختصر یہ ہے کہ آپ ان کی منظوری استعفا اور تقرر پنشن مناسب پر سعی فرماویں۔ آپ کی ادنا کوشش سے بہت آسانی سے ہو سکے گا اور مہدی علی دونوں آپ کے نہایت ممنون احسان ہوں گے۔ میں ۳۰ ستمبر کو علی گڑھ واپس جاؤں گا۔ والسلام۔

خاکسار

سید احمد، الٰہ آباد

۲۶ ستمبر، ۱۸۸۹ء

## (۷)

**بنام عنایت اللہ**

عزیزی عنایت اللہ!

تمھاری علالتِ طبع کا جس قدر مجھ کو افسوس رہا ہے وہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اس وقت تمھارا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ اب فضل الٰہی سے صحت کلی ہے۔ اُس سے نہایت خوشی ہوئی۔ خدا تم کو صحیح اور تندرست رکھے اور اُس اعلا درجہ ترقی پر دنیا میں پہنچا دے جس کے لیے تم میری رائے میں لائق ہو۔ مجھ کو یاد نہیں آتا کہ مجھ سے اور نواب محسن الملک سے کبھی سوائے تمھاری لیاقت اور سعادر مندی اور نیکی کے کسی اور قسم کا ذکر کسی اور ارادے سے ہوا ہو۔ شاید ایک دفعہ اُس تحریک کا ذکر ہوا تھا جو تمھارے لیے گورنمنٹ سے کی گئی تھی۔ پس مہدی علی نے جو کچھ تمھارے والد کو لکھا ظاہراً تو بسبب تمھارے والد کی محبت اور تمھاری صحت کے خیال سے لکھا ہوگا اور کیا عجب ہے کہ کوئی اور بات بھی اُن کے ذہن میں ہو۔ تمھارے والد کی آمدنی اس قابل نہیں ہے کہ وہ سب کا بوجھ اُٹھا سکیں۔ پس ضرور ہے کہ تم اپنے لیے کچھ فکر کرو۔ میں نے سنا ہے کہ جو اختیارات مولوی مہدی علی کے سلب ہو گئے تھے وہ پھر ان کو واپس ہو گئے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو حیدرآباد میں تمھارے لیے کوئی صورت مناسب نکل آئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ اگر تم اس ارادے میں مستقل ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ تمھاری والدہ صاحبہ اُس پر راضی ہیں تو میں اس باب میں اُن سے خط و کتابت کروں۔ اس کا جواب مستحکم بھیجو۔ تم دہلی میں جا کر ایسے بیٹھ رہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لیے بھی کہیں نہیں نکلے۔ تم میرے پاس علی گڑھ میں آؤ۔ میرے پاس ہفتے دو ہفتے رہو۔ دہلی سے علی گڑھ کی آب و ہوا بہت اچھی ہے تمھارا دل بہلے اور طبیعت درست ہو۔ غالباً ابتدا نومبر میں دہلی آؤں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی میرے ساتھ یہاں چلے آؤ۔ اس عرصے میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ در حقیقت مہدی علی کا اب کیا حال ہے اور اُن سے خط و کتابت کا بھی بخوبی موقع ملے گا۔

مولوی مشتاق حسین کے حیدرآباد سے چلے آنے کا نہایت افسوس ہے مگر انھوں نے رسی کو ایسا تانا تھا کہ اُس کا ٹوٹ جانا ایک نہ ایک دن ضرور تھا۔ مگر نہایت افسوس کی بات ہے جو اُنھوں نے ایسا کیا تھا اور اپنے محسنوں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا تھا جو مناسب نہ تھا۔ بہرحال امور تقدیری کسی طرح رک نہیں سکتے۔ والسلام۔

خاکسار

سید احمد، علی گڑھ۔

۲۵ اکتوبر ء

☆☆☆